APRIL
2022

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

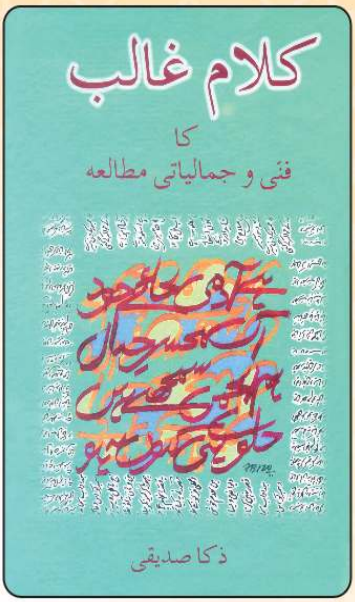

کلام غالب
کا
فنی و جمالیاتی مطالعہ
ذکا صدیقی

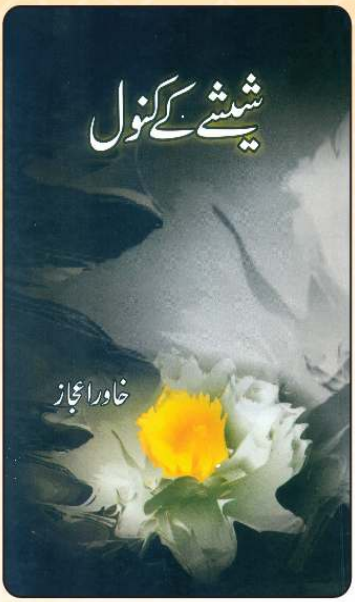

شیشے کے کنول
خاور اعجاز

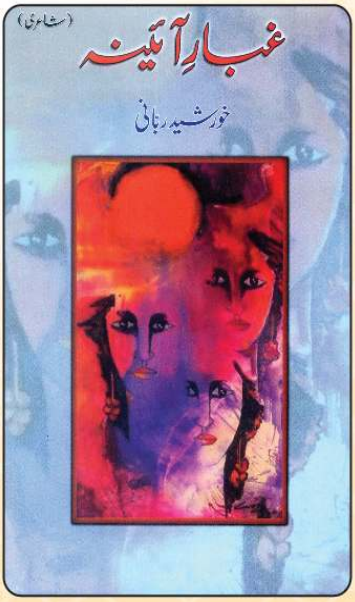

(شاعری)
غبارِ آئینہ
خورشید ربانی

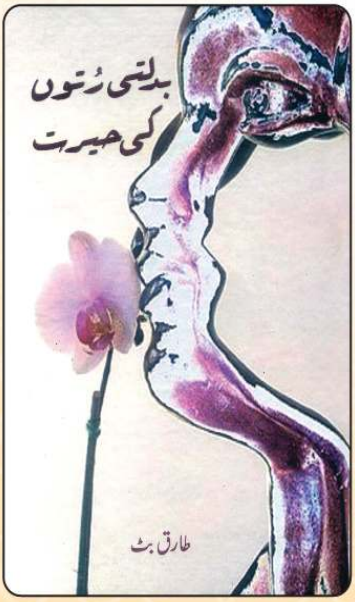

بدلتی رُتوں
کی حیرت
طارق بٹ

خدشہ

یہی زرد زرد راتیں ، یہی دَرد دَرد باتیں
یہی سَرد سَرد لہریں ، یہی گرد گرد نہریں
مرے حال تک کسی دن، ترا حال آ نہ جائے
وہی قحط پڑ نہ جائے وہی سال آ نہ جائے
مری زندگی میں تجھ پر یہ زوال آ نہ جائے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا نقیب

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 30 - اپریل 2022 - شمارہ نمبر: 4

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

جاہد احمد	کنور امتیاز احمد	نوید صادق	نعمان منظور	اعجاز رضوی

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد　　کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: رمضان مبارک　　قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000　فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com　www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر روڈ بالمقابل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	نسیم سحر، حامد یزدانی، فرحت عباس، سرور حسین نقشبندی رانا خالد محمود قیصر	7 تا 11
2	نعت	آصف ثاقب، جلیل عالی، ہارون الرشید، اکرم ناصر، محمد انیس انصاری عقیل رحمانی، افتخار شاہد، علی رضا، اعجاز دانش	12 تا 20
3	عقیدت	مرزا آصف رسول، احمد جلیل	21 تا 23
4	رباعیات	گلزار بخاری	24
5	قطعات	محمود کیفی	25
6	ماہیے	خاور اعجاز	26
7	ہائیکو	حامد یزدانی	27
8	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	28 تا 32
9	مضامین	ناصر علی سید، اختر شمار، شفیق احمد خان، محمد نوید مرزا احسان فیصل کنجاہی، رومانہ رومی، صدام ساگر مرزا صہیب اکرام، ریاض ندیم نیازی، خالد سعید سیدہ آمنہ ریاض، جمیل حسین کھنانہ، فضیلت حسین	33 تا 87
10	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	88 تا 96
11	افسانے	اسلام عظمی، حامد یزدانی، دردانہ نوشین خان صبا ممتاز بانو، آسناتھ کنول، رینو بہل، عروج راؤ	97 تا 133

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
12	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، جلیل عالی، جمیل یوسف، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، خاور اعجاز، گلزار بخاری، خالد علیم، احمد حسین مجاہد، تاثیر نقوی، سید قاسم جلال، محمد انیس انصاری، جان کاشمیری، اقبال سروبہ، راحت سرحدی، رشید آفرین، عقیل رحمانی، منظور ثاقب، علی اصغر عباس، ممتاز راشد لاہوری، اکرم ناصر، جسارت خیالی، شاعر علی شاعر، اوصاف شیخ، ناصر بشیر، حسنین سحر، سحر تاب رومانی، شاہد اشرف، انصر حسن، علی ارمان، محمد سلیم ساگر، اشرف کمال، اظہر عباس، آفتاب خان، صغیر احمد صغیر، اعجاز روشن، شاہد فرید، رمزی آثم، افتخار شاہد، اسحاق وردگ، ذکی طارق، شاہد ماکلی، سید مقبول حسین، طاہر ناصر علی، شوکت محمود شوکت، فیض رسول فیضان، امر مہکی، آسناتھ کنول، عمر قیاز قائل، عطا العزیز، ارشد محمود ارشد، کیفی قلندر، امتیاز انجم، مرزا سکندر بیگ، عاطف جاوید عاطف، اکرم جاذب، وسیم جہران، علی حسین عابدی، بشیر احمد حبیب، عاصم اعجاز، اعجاز دانش، عنبرین عنبر راجپوت، جیا قریشی، شفقت حیات شفق، نائلہ راٹھور، صدام ساگر، انیس احمد، عنبرین علی خان، ضیا شاہد، میتھیو محسن، عمران حیدر مدحر، زین علی رضوی، کنور امتیاز احمد، اعجاز رضوی	134 تا 209
13	شاعرِ امروز	مظہر نقوی، اسامہ خالد [شاہد ماکلی]	210 تا 215
14	نظمیں	امجد اسلام امجد، جمشید چشتی، حسنین سحر، اصغر علی بلوچ، شوکت محمود شوکت، سرور حسین نقشبندی، رخشندہ نوید، طالب انصاری، زعیم رشید، فرح شاہد، اویس جمیل	216 تا 227
15	خطوط	آصف ثاقب، نسیم سحر، آفتاب احمد ملک، ممتاز راشد لاہوری، ہارون الرشید، فیض رسول فیضان، محمد انیس انصاری، طالب انصاری، اشرف کمال، حکیم خان حکیم، رانا محمد شاہد	228 تا 241

حمد

اَور کوئی نہیں چار سُو ، تُو ہی تُو
ہر طرف ایک آواز ہُو ، تُو ہی تُو

وجہِ تخلیق و وجہِ نُمو تُو ہی تُو
سینۂ سنگ میں آبجو تُو ہی تُو

ہوں ازل تا ابد مَیں سفر در سفر
ہر سفر میں مِری جستجو تُو ہی تُو !

تخیلے میں ہے افضل ترا تذکرہ
بزم میں حاصلِ گفتگو تُو ہی تُو!

میرے رُخ پر خجالت کی زردی بھی ہے
مُجھ کو رکھتا بھی ہے سرخرو تُو ہی تُو

دُور ہم تُجھ سے ہیں، تُو تو ہم سے نہیں!
ہے قریبِ رگِ ہر گلو تُو ہی تُو

رنگ سارے ترے، نکہتیں سب تری
پھُول میں صورتِ رنگ و بُو تُو ہی تُو

ہر طرف ہے ترا نام مہکا ہوا
مُشک تُو، مُشکبو، مُشک خو تُو ہی تُو

کون اوجھل بھی ہے ظاہری آنکھ سے
کون جلوہ نُما سُو بسُو؟ تُو ہی تُو

تُو ہی تُو ، تُو ہی تُو ، اَور کچھ بھی نہیں
اَور کچھ بھی نہیں، تُو ہی تُو ، تُو ہی تُو!

چاک دامن نسیمِ سحر آ گیا
کیونکہ اُس کا ہے دستِ رفو تُو ہی تُو!

نسیمِ سحر

حمد

روشن ہے تجھ سے کُو بہ کُو، اللہ جلّ شانہٗ
ہے نور تیرا چار سُو، اللہ جلّ شانہٗ

اے خالقِ کون و مکاں، قدرت کا تیری ہے نشاں
یہ کائناتِ رنگ و بُو، اللہ جلّ شانہٗ

روزِ ازل سے تا ابد، گونجے سدا 'اللہ صمد'
ہر سمت ہے: 'اللہ ھُو'، اللہ جلّ شانہٗ

روح و دل و جاں کے مکیں، تو ہے رگِ جاں سے قریں
پھر بھی ہے تیری جستجو، اللہ جلّ شانہٗ

جاں سُکھ میں ہو دل چین میں، حاضر ہوں ہم حرمین میں
ہے یہ دعا، یہ آرزو، اللہ جلّ شانہٗ

تیرے کرم کی انتہا، سانسوں میں چلتی ہے ثنا
جیسے رگوں میں ہے لہو، اللہ جلّ شانہ

سب تجھ سے ہے، سب کچھ ترا، پھر شکر ہو کیسے ادا
بن مانگے سب دیتا ہے تُو، اللہ جلّ شانہٗ

میں نے کہا: ''آزار ہے، دل میں خطا کا بار ہے''
تو نے کہا: ''لا تقنطو''، اللہ جلّ شانہٗ

احباب و آلِ مصطفےٰ، عکسِ جمالِ مصطفےٰ
ہیں اولیاؔ آئینہ رُو، اللہ جلّ شانہٗ

سب سے حسیں تیری عطا، یعنی محمد مصطفےٰ
میں نام لوں کر کے وضو، اللہ جلّ شانہٗ

حامد یزدانی

حمد

توفیق ایسی بخش مکرّر ، مرے خدا
ہو مدحتِ حضورؐ زباں پر ، مرے خدا

ایسا مجھے بنا دے سخن ور، مرے خدا
حدِ ادب سے جاؤں نہ باہر ،مرے خدا

تخلیقِ دو جہاں کا سبب جنؐ کی ذاتِ پاک
ان کے لئے درودِ معطر، مرے خدا

سردارِؐ کائنات ہیں میرے حضورِؐ پاک
تجھ سے ہی اُنؐ کا نور منوّر، مرے خدا

حق کی حدیث، صاحبِ قرآں کے واسطے
میری زباں میں اور اثر کر، مرے خدا

توصیفِ مصطفےٰؐ کا جو منصب مجھے ملا
کیسا دیا مقامِ معطر، مرے خدا

فرحتؔ ہو ذکرِ سیدِ والا ہزار بار
دونوں جہاں میں دھوم ہو بڑھ کر، مرے خدا

فرحت عباس

حمد

صبح طائر جو چہچہاتے ہیں
تیری تسبیح گنگناتے ہیں

اے خدا تجھ سے عرض کرتے ہوئے
اشک آواز بنتے جاتے ہیں

عرش کے آخری کناروں تک
پرچمِ حمد لہلہاتے ہیں

ورد ہوتا ہے "الصمد" جن کا
ناز دنیا کے کب اٹھاتے ہیں

ماند پڑتے ہیں سب سخن کے پھول
جب گلِ حمد کھلکھلاتے ہیں

ان کے مرقد میں روشنی ہو گی
مشعلِ ذکر جو جلاتے ہیں

آؤ سرور کہ حجرۂ جاں میں
بندگی کا دیا جلاتے ہیں

سرور حسین نقشبندی

حمد

صبح ہوتی ہے خدا کے نام سے
دن گزرتا ہے بہت آرام سے

جب بھروسا ہے خدا کی ذات پر
کیوں ڈروں میں گردشِ ایام سے

ہے فلاحِ نوعِ انساں آشکار
ربِ اکبر کے ہر اک پیغام سے

جو مری شہ رگ سے بھی نزدیک ہے
زندگی روشن ہے اس کے نام سے

ربِ عالم ایک ہے قیصر فقط
یہ سبق ہم کو ملا اسلام سے

رانا خالد محمود قیصر

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

وسعتِ کائنات عشق دِکھا
ربِ قوسین! نقطۂ پرکار

نعتؐ

مرا ایمان نصرت ہے مدینے کی
مقدر میں قیادت ہے مدینے کی

مجھے حاصل شریعت حق تعالیٰ سے
قرینے میں طریقت ہے مدینے کی

ہر اک انسان کا اِس میں بھلا رکھا
جہانوں میں نبوت ہے مدینے کی

بہت ہی دور ہوں میں دل کی کالک سے
مرا مسلک ہدایت ہے مدینے کی

خیالوں میں اجالا خانہ کعبہ کا
دعاؤں میں جلالت ہے مدینے کی

کٹے آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ رو رو کر
مری ہر شب ودیعت ہے مدینے کی

میں ثاقبؔ شاد اور آباد رہتا ہوں
مرے دل میں محبت ہے مدینے کی

آصف ثاقب

نعتؐ

مدح کی مشکلوں سے ڈرتے ہیں
لفظ اپنی حدوں سے ڈرتے ہیں

اے شہِ ثَورؐ ! تیرے دیوانے
کب جہاں کے ڈروں سے ڈرتے ہیں

حوصلہ بس حِرا سے ملتا ہے
جب بھی تنہائیوں سے ڈرتے ہیں

تیری دُھن میں سلجھتی جاتی ہیں
ہم کہ جن الجھنوں سے ڈرتے ہیں

اہلِ باطل کہ کج کلاہِ حرم
سب ترےؐ عاشقوں سے ڈرتے ہیں

کیسے کیسے شہانِ جاہ و جلال
تیرےؐ خستہ تنوں سے ڈرتے ہیں

معجزہ ہے کہ اب بھی، شب زادے
تیرےؐ روشن دنوں سے ڈرتے ہیں

ہم ترےؐ اور خدا کے پروانے
کہاں فرعونیوں سے ڈرتے ہیں

جلیل عالی

نعتؐ

دیکھتا جا رہا ہوں حرم کی طرف
پاؤں اٹھنے لگے ہیں ارم کی طرف

ہے خبر اُن کو ہوں اُن کے دربار میں
ذہن ہے ان کی چشمِ کرم کی طرف

سوچتا ہوں وہ سونا کسے مل گیا
دیکھ کر ان کے نقشِ قدم کی طرف

آنکھ بھر آئی دل ٹوٹ کر رہ گیا
جب چلا میں وہاں سے عجم کی طرف

وہ یہیں ہیں ، رہیں گے یہیں عمر بھر
کب گئے ہیں یہاں سے عدم کی طرف

عزّتیں ہیں تو ان کی غلامی میں ہیں
ہے عبث دھیان جاہ وحشم کی طرف

ہارون الرشید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس رُخ کروں قصیدۂ شاہِ زَمن تمام
تشبیب ہی میں ہو گئی تابِ سخن تمام

نعتؐ

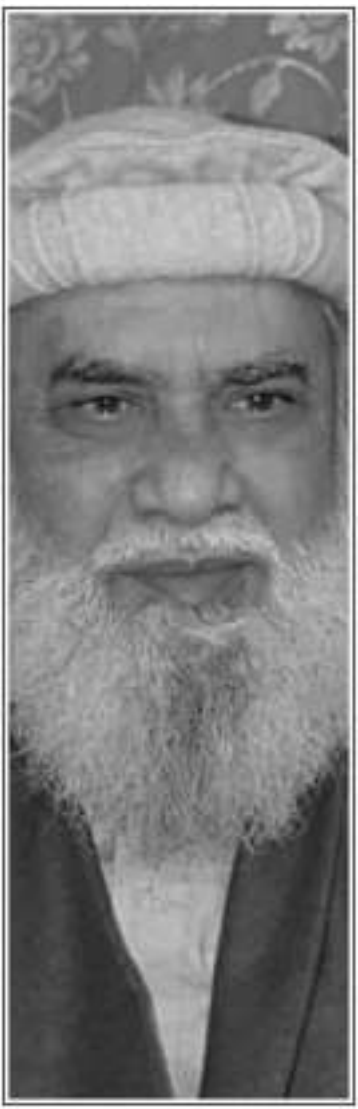

کیا بھاگ لگے دیکھیے طیبہ کی زمیں کو
حالات اٹھا لائے ہیں مکہ کے مکیں کو

اعزاز ہے یہ امتی ہیں ان کے، کہ جن کی
آمد کا ہے اعزاز ملا روئے زمیں کو

مانگا ہے دعا کر کے کہ یارب مجھے دے دے
وہ شخص جو جھٹلاتا ہے صادق کو امیں کو

سچ ہے جو کہا احمدِ مرسل نے، یقیں ہے
ڈالا نہ تذبذب میں کبھی اپنے یقیں کو

ایسا نہ کبھی پہلے ہوا اور نہ ہو گا
اک فرش نشیں کی تھی طلب عرش نشیں کو

جس حسن کی تعریف میں قرآں ہوا نازل
میں چاہتا ہوں دنیا کے اس سب سے حسیں کو

ان کے لئے بیتاب ہے دل میرا بھی اکرم
چاہت تھی جنہیں دیکھنے کی عرش بریں کو

اکرم ناصر

نعتؐ

ہُنرِ شعر و سخن ہے تو لِکھو نعت اُنؐ کی
رات دن ذکر کرو اُنؐ کا، کرو بات اُنؐ کی

مرکزِ لوح و قلم، شاہِ حرم، تاجِ اُممؐ
محورِ مدح و ثنا ہے، تو فقط ذات اُنؐ کی

پاک کر دے جو گناہوں سے گنہگاروں کو
ایسی برسات ہے، رحمت بھری برسات اُنؐ کی

سوچتا ہوں جو کبھی قبر کی اوّل شب کا
دھیان میں جُھومنے لگتی ہیں عنایات اُنؐ کی

اُنھیں سوچوں، اُنھیں چاہوں، اُنھیں دیکھوں پَل پَل
مِرا ہر دِن ہو اُنہی کا، مری ہر رات اُنؐ کی

کوئی دِن آئے گا ایسا بھی کہ لکھّی ہو گی
مِری آنکھوں کے مقدر میں بھی اِک جھات اُنؐ کی

پیش کرنا ہے اُنھیں نعت کا مجموعہ انیسؔ!
اور انعام میں پھر پانی ہے خیرات اُنؐ کی

محمد انیس انصاری

نعتؐ

اُڑ کے پہنچوں اگر مدینے میں
کاٹ دوں اپنے پَر مدینے میں

کب ہے جنت کی آرزو مولا
دے دے چھوٹا سا گھر مدینے میں

آپ چاہیں تو کٹ ہی جائے گا
زندگی کا سفر مدینے میں

بن کے مہمان اپنے آقاؐ کے
ہم ہوئے معتبر مدینے میں

روشنی مانگتے ہیں روزانہ
آ کے شمس و قمر مدینے میں

یہاں شاہ و گدا کا فرق نہیں
سب جُھکاتے ہیں سَر مدینے میں

اپنے اعمال پر کروں جو نظر
رہتی ہے چشم تر ، مدینے میں

رات کاٹی ہے عمر بھر ہم نے
ہو گی اپنی سحر مدینے میں

بھیک لے لے عقیلؔ بخشش کی
اپنی جھولی کو بھر مدینے میں

عقیل رحمانی

نعتؐ

جن ہواؤں کا مدینے سے گزر ہو جائے
ان کا تو سارا سفر کارِ ہنر ہو جائے

صرف اک بار مدینے سے بلاوا آئے
اور پھر عمر وہیں ساری بسر ہو جائے

ایک ہی رات میں یوں باغ کی قسمت بدلے
ایک ہی رات میں پھلدار شجر ہو جائے

آپ کے حسنِ سماعت کی کوئی حد ہی نہیں
میں پکاروں تو مدینے میں خبر ہو جائے

نام لیتے ہوئے ٹل جائے مصیبت کی گھڑی
اسم پڑھتے ہوئے دیوار میں در ہو جائے

اپنے آنگن میں جلاتا ہوں درودوں کے دیئے
عین ممکن ہے کہ گھر رشکِ قمر ہو جائے

بادشاہوں سے بھی اونچا ہو نصیبا میرا
آپ کی ایک نظر آقا اگر ہو جائے

آپ کا حکم میرے واسطے لازم ٹھہرے
آپ کی یاد مرا زادِ سفر ہو جائے

میں نے اک بار تو روضے کی زیارت کی ہے
یہ کرم مجھ پہ اگر بارِ دگر ہو جائے

ڈھلنے والا ہے مری عمر کا سورج شاہد
رات سے پہلے مجھے اذنِ سفر ہو جائے

افتخار شاہد

نعتؐ

پڑا رہے گا اسی در پہ اب غلام ، مدام
کٹیں گے ان کے ہی کوچے میں صبح و شام، مدام

ثنائے سرورِ کون و مکاں مرا اعزاز
کیا ہے میں نے اسی روشنی کو عام مدام

کرم نبی کا سدا میرا دستگیر رہا
ہر امتحاں میں رہا ہوں میں شاد کام مدام

یہی غموں سے رہائی کی ایک صورت تھی
رہا لبوں پہ درود اور مرے سلام مدام

میں جب سے حسرت دیدار لے کے بیٹھا ہوں
کیا ہے آنکھوں نے اشکوں سے اہتمام مدام

یہ ٹھان لی ہے فقط ان کی نعت لکھوں گا
رہے گا نذر انھی کی مرا کلام مدام

جسے حضور کے فیضِ نظر سے نسبت ہے
چلے گا سارے جہاں میں وہی نظام مدام

علی رضا

(نوٹ) یہ نعت مارچ 2022 کے شمارے میں علی رضا احمد کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ ادارہ معذرت خواہ ہے

نعتؐ

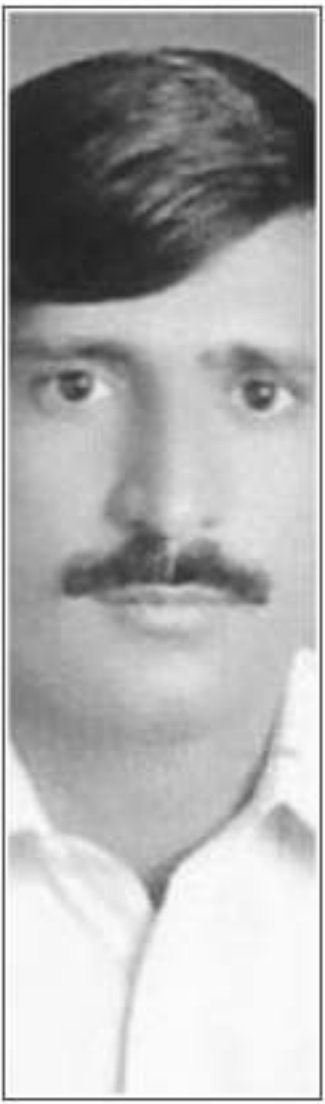

آنکھوں کو مقدر سے مدینہ نظر آیا
ہر سمت اجالا ہی اجالا نظر آیا

ہر شخص ترےؐ عشق میں ڈوبا ہوا دیکھا
ہر شخص تریؐ دید کا پیاسا نظر آیا

وہ بے خود و سرشار ہوا ایک نظر میں
اک بار جسے تیراؐ سراپا نظر آیا

جس راہ سے گزری مرے آقاؐ کی سواری
بہتا ہوا انوار کا دریا نظر آیا

زائر کی نگاہوں کو ملی تازگی اس پل
جب گنبدِ خضرا کا نظارہ نظر آیا

نسبت نے تریؐ حشر میں امید بندھائی
امت کو فقط تیرا سہارا نظر آیا

سرکارؐ مدینہ کی غلامی کے علاوہ
دانش کو خسارہ ہی خسارہ نظر آیا

اعجاز دانش

رحمتِ حق

رحمتِ حق بہ ہر ادا صل علی محمدٍ
وہ ہیں جہاں وہیں خدا صل علی محمدٍ

صَلِّ عَلیٰ نَبِیِّنَا میں اُسی لاشریک نے
سب کو شریک کرلیا صل علی محمدٍ

ان پہ درود بھیج کر خوئے کرم ہے معتبر
جود و سخاوت و عطا صل علی محمدٍ

ان پہ درود سے بجھی نارِ عداوت و فساد
صُلح و سلامتی، بقا صل علی محمدٍ

ان پہ درود سے گئیں فکر و نظر کی پستیاں
علم و شعور وارتقا صل علی محمدٍ

ان پہ درود سے دُھلیں شرک کی سب نجاستیں
آبِ طہور تزکیہ صل علی محمدٍ

ان پہ درود سے مٹیں خَلق و خدا میں دوریاں
سجدۂ قُرب کی بنا صل علی محمدٍ

ان کے درود سے ہوئے بند خیانتوں کے در
کنزِ امانت و غنا صل علی محمدٍ

ان کے درود سے گرے کذب و دروغ کے ستوں
صدق و حقیقت و صفا صل علی محمدٍ

ان پہ درود سے چھٹیں مکر و فسوں کی ظلمتیں
قلبِ سلیم کی جلا صل علی محمدٍ

ان کے درود سے گرے فسق و فجور منہ کے بل
غیرتِ حق علَم کشا صل علی محمدٍ

ان پہ درود سے کھلے نصرتِ حق کے راستے
عہد و عزیمت و وفا صل علی محمدٍ

ان پہ درود سے ہوا چہرۂ شر کا رنگ فق
خیر و فلاح کی ضیا صل علی محمدٍ

ان پہ درود سے ہوئی زینتِ جامۂ خُلق
پیکرِ زندگی سجا صل علی محمدٍ

ان کے درود نے کیا سترِ معاشرت رفو
عصمت و عفت و حیا صل علی محمدٍ

ان پہ درود و صبر سے بدلا ہے رنگِ دوستی
عفو و حمایت و رضا صل علی محمدٍ

مرزا آصف رسول

ان پہ درودِ عشق نے توڑے ہیں نفرتوں کے بت
حب واخوت و ولا صل علی محمدٍ

ان پہ درودِ علم سے عقل وخرد کی رفعتیں
معرفتِ خدا رسا صل علی محمدٍ

ان پہ درودِ عدل نے چھینا ہے دستِ ظلم سے
قوت وحکم کا عصا صل علی محمدٍ

ان پہ درودِ زُہد نے کاسے بھرے ہیں فقر کے
گنجِ قناعت وزکا صل علی محمدٍ

ان پہ درودِ بندگی سے ہے بشر کی حریت
پرچمِ عزت وعلا صل علی محمدٍ

جان ودل ونگاہ نے پوچھا زبان ونطق سے
ہے یہی بس درود کیا؟ صل علی محمدٍ

جب کوئی اور دوسرا، تھا نہ کہیں بہ جز خدا
تب بھی درود ان پہ تھا صل علی محمدٍ

آصف! اگر کوئی نہ ہو ان پہ درود کے لئے
حسنِ ازل ہے خود نما صل علی محمدٍ

رحمت کی گھٹائیں

احمد جلیل

گناہوں کے اگر انبار بھی ہوں
سیہ دفتر ہوں چاہے معصیت سے
مرے آقاؐ کی رحمت کی گھٹائیں
برس کر صاف کر دیتی ہیں اُن کو
بہت شفاف کر دیتی ہیں اُن کو
سراپا پاک کر دیتی ہیں اُن کو
مرے آقاؐ کی رحمت کی گھٹائیں
برستی رہتی ہیں، تھکتی نہیں ہیں
تہی ہوتی نہیں یہ پانیوں سے
میں تکتا رہتا ہوں حیرانیوں سے!

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تمام عمر بس اک رت جگے میں بیت گئی
تمام عمر ہم اک مہرباں کے ساتھ رہے

رباعیات

کم کم ہی وفا قرب کو تجتے دیکھی
ہر سیج رفاقت سے ہی سجتے دیکھی
لازم ہے کہ ہو دوسرا بھی اس میں شریک
اک ہاتھ سے تالی نہیں بجتے دیکھی

اچھی ہے وہ عورت جو ہنر والی ہو
شوہر کے لیے خیر خبر والی ہو
لگتی ہے بھلی سب کو ہی اچھی بیوی
ہر چند کے فرعون کے گھر والی ہو

نام اور مقام کے حوالے ہیں بہت
تحسین کے معیار نرالے ہیں بہت
کردار کی تعظیم ہے کم لوگوں میں
منصب کو سلام کرنے والے ہیں بہت

ممکن ہے تو سجدے میں جھکاتا ہوں جبیں
ہیں نطق و زباں مدحِ محمد کے امیں
رب نے نہ کیا فکر سے عاجز مجھ کو
فالج زدہ ہوں شکر ہے مفلوج نہیں

تو خوش ہے کہ ترغیب ہوس ہے تجھ میں
لیکن یہ کشش چند نفس ہے تجھ میں
اے گل اسے بے لوث رفاقت نہ سمجھ
بھنورے ہیں ترے گرد کہ رس ہے تجھ میں

گلزار بخاری

قطعات

کوئی بہار میں، کوئی خزاں میں افسردہ
کوئی سفر میں تو کوئی مکاں میں افسردہ
بہت سے لوگ ہیں دُنیا میں غم زدہ کیفی!
نہیں ہے تُو ہی اکیلا جہاں میں افسردہ

.....

مجھے پلاؤ کوئی زہر کا ہی پیالا تم
یہ جامِ شیریں بھلا پی کے کیا کروں گا میں؟
بِنا تمھارے یہاں میرا دِل نہیں لگتا
بِنا تمھارے یہاں جی کے کیا کروں گا میں؟

.....

نہ مال و زر نہ میں دُنیا کے مرتبے چاہوں
تمھارے در کو جو جائیں، وہ راستے چاہوں
تمھاری یاد سے دِل کو سکون مِلتا ہے
اگر تمھیں نہ میں چاہوں تو پھر کسے چاہوں؟

.....

میں جانتا ہوں، نہیں تم مِرے طبیب، مگر
میں چاہتا ہوں کہ بن کر مِرے طبیب رہو
قریب رہنے کے قابِل تو میں نہیں، لیکن
ہے پھر بھی تم سے گزارش، مِرے قریب رہو

رہا میں جس کے سبب تا حیات افسردہ
یہ میرے دِل سے وہی غم نِکلنے والا ہے
مِرے طبیب، مِرے چارہ گر، دوامت دے
ترے مریض کا اب دم نِکلنے والا ہے

.....

سفر پہ نِکلا مُسافر، مکان چھوڑ گیا
وہ جاتے جاتے بھی اپنا نشان چھوڑ گیا
خیال و خواب کی دنیا کا تھا مکیں کیفی
خیال و خواب کی اِک داستان چھوڑ گیا

محمود کیفی

ماہیے

خاور اعجاز

بادل تو برستا ہے
جیون کا صحرا
پھر کس کو ترستا ہے

منکے لیے پھرتے ہو
پھر کیوں سانپوں کی
پھنکار سے ڈرتے ہو

ہنستی نہ ہنساتی ہے
ساون کی رُت بھی
بس آگ لگاتی ہے

رستوں میں نہ کھو جانا
جو ہنس کر دیکھے
بس اُس کے ہو جانا

بادل جو برستا ہے
صحرا سے آگے
شاید کوئی رستا ہے

ہائیکو

کشتیوں کی طرح رواں بادل
پنچھی بہتے ہیں مچھلیوں کی طرح
آئنہ آئنہ ہے یہ دریا

.....

رُت بدلنے کی دیر تھی حامد
دھوپ بُنتی ہوئی فضاؤں میں
ہجرتوں کے پرند لوٹ آئے

.....

گیت مہکے ہوئے فضاؤں میں
لہلہاتا غبار رنگوں کا
کس قدر دل نشیں ہے ویرانہ

.....

کِھلتے اپریل کے فلک کی طرف
کچھ پرندے اُڑے ہیں پانی سے
پھر بھنور سے ہَوا میں پڑنے لگے

.....

نوجواں دل کہ خون کی حدت
زندگی، دھوپ، جون کی حدت
کشتیاں، قہقہے، سہانی جھیل

سانپ کی طرح سرسراتی ہَوا
بیریاں چھپ رہی ہیں پتوں میں
جھاڑیوں میں ہے تتلیوں کا ہجوم

حامد یزدانی

سراغِ زندگی

زندگانی کا سراغ کوئی ایسا مشکل بھی نہیں کہ جسے پانا سکے ازل سے لے کر ابد تک دنیا کے تمام مذاہب اس سراغ کا پتہ دیتے ہیں۔
ہر مذہب کو دیکھ لیں یا تقابل ادیان کے رنگ میں دیکھ لیں محبت کی اک بڑی روشنی اس مذہب یا دین ہی کی شریعت سے پھوٹتی ہے جو دلوں کو اک زنجیر میں باندھ دیتی ہے یہ روشنی جب دین حق اسلام کے جگر سے پھوٹتی ہے تو وہ صرف محسوساتی سی جھلک نہیں ہوتی بلکہ وہ اک طرزِ حیات اور طرزِ زندگی عطا کرتی ہے جس کی روشنی میں زندگی کے اور معاملات کے سبھی سوالوں کے آسان جواب مل جاتے ہیں انسان اکانومی پڑھتا ہے معاشیات پڑھتا ہے تعلقات عامہ پر سیمینار کرواتا ہے مگر یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ بعض لکھاری اور رائٹر بھی ہوتے ہیں فلسفہ اور اخلاق پر بہت سی کتابوں کے مصنف ہونے کے باوجود خود بداخلاق ہوتے ہیں ہمارے بابا جی واصف علی واصف رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے بدعملی بے عملی سے زیادہ نقصان دہ ہے۔
محبت کی یہ روشنی جو شریعت ہی سے نکلتی ہے انسانوں کا رخ مادیت سے موڑ کر واحدانیت کی طرف لے آتی ہے یہی تصوف ہے اور اس پر کار بند ہونے والا صوفی ہے تصوف ہمیں مرکوز کرتا ہے چیزوں کی ہوس ہمیں منتشر کرتی ہے۔ دنیاوی امارتوں کو حاصل کرنے والے عام انسان کو انسان سے دور کرتے ہیں انسان کو انسان کا محکوم بناتے ہیں مجبور بناتے ہیں جب کہ اس کے برعکس اسلامی تصوف تو انسان کو انسان کے قریب کرتا ہے دُکھوں کو دور کرنے کی تربیت بھی دیتا ہے دکھوں کو سہنے کا حوصلہ اور پھر مالک سے دعا پر اُبھارتا بھی ہے دنیا کے سارے معالج سبھی ماہرین نفسیات اور فائیو اسٹار سہولتوں والے ہسپتال مل کر بھی کسی ناشاد کسی

سلیمان عبداللہ ڈار

دُکھی کسی مایوس اور کسی بے مہر انسان کے دل میں محبت کی جوت اور جوگ جگا نہیں سکتے جو من صوفی اور اللہ سے پیار کرنے والا کسی دلپذیر طریقے سے من میں متصوفانہ رنگ پیدا کر کے دکھا سکتا ہے فطرتاً آزاد پیدا ہونے والے انسان کو آج کے ہوشربا سائنسی اور مشینی دور نے دفاتر اور افسروں کا اور فیکٹریوں کا غلام بنا دیا ہے بندہ بھی عجیب ہے آج کل کا انسان تو اس سے بھی عجیب ہے۔

اس کی دلفریبی بھی کیا عجب ہے کہ دل ہی کو اس فریب کا پتہ نہیں چلتا تو سراغ کہاں سے ملے یہ اشارہ یا سچی روحوں کا ایڈریس اللہ والی چاہ کی راہوں کا پتہ اللہ والوں ہی سے ملے گا یہی انسانیت کو منہدم ہونے سے روکیں گے یہی اس کی تعمیر کریں گے بہت سے مسائل آج کے انسان کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ کان میں روئی ٹھوس لینے سے پریشانیوں کا شور کم نہیں ہوگا اللہ کی محبت تو زندگی کے سبھی عناصر کے ساتھ ایک تعلق پیدا کرنے کی ترغیب دیتی ہے یہ محبت پیسے سے دور نہیں کرتی بس پیسے کو ایمان بنانے سے روکتی ہے اور ٹوکتی بھی ہے کیوں؟ اس لئے کہ پیسہ کسی حد تک آپ کو اُوپر تو لا سکتا ہے مگر آپ پیسے کو اوپر نہیں لے جا سکتے اور اوپر تو ہمیں اور بس ہمارے اعمال ہی کو جانا ہے۔

اللہ جل شانہ کی چاہت یا تصوف زندگی کی مثبت صورتوں کو اجاگر کرتا ہے چاہت والی یہ سوچ بندے کو اعلیٰ اخلاقی اور قانونی حدود عطا کرتی ہے اور اک ایسی معیاری زندگی کی نشاندہی کرتی ہے جو قابل عمل بھی ہے کہ اللہ جل شانہ کی چاہ اس جہاں میں سب سے زیادہ انبیاءؑ کو ملی اس سے کہیں زیادہ سرکار دو عالمؐ کو عطا ہوئی جس کی چاہ نے نا صرف اک بکھری ہوئی پر مردہ حال قوم کو اکٹھا کیا بلکہ اسی چاہت (یا تصوف) سے غیر قومیں دوسرے ممالک اور سلطنتیں بھی اسلام کے بینر تلے آتی گئیں کہ انھیں نا صرف اس زندگی کا بلکہ حیات جاوداں کا سراغ مل گیا تھا۔

تصوف کی باقاعدہ حدود و قیود ہیں بعض جاہل اور So Called صوفیوں کے ہاں ان حدود کی Violation ہو تو وہ نا ہی شریعت کے دائرے میں آتی ہیں نا ہی تصوف سے اس رجحان کا کوئی تعلق ہے سچے اللہ والے سنت سے احراف کرتے ہی نہیں اصلی چاہت اور تصوف تو اپنے پروردگار سے سالکین سے اور صوفیا سے اسلامی اعلیٰ اقدار اور اعلیٰ معیار کا تقاضا بھی کرتا ہے سچا صوفی کبھی سنتِ رسولؐ سے ہٹنے کا سوچ بھی نہیں سکتا راقم کو پہلی جماعت کی اردو کی کتاب میں درج ایک چھوٹا سا نگر رتبے کے لحاظ سے بڑا واقعہ یاد آتا ہے۔

تصوف اور کرامات کا کوئی طالب دور دراز سے حضرت علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا کئی سال وہ آپ کے

پاس ٹھہرا۔ اک روز حاضر ہوا اور اپنے گاؤں واپس جانے کی اجازت چاہی عرض کیا کہ بڑی مایوسی کی حالت میں گاؤں جا رہا ہوں۔ آپ نے سبب پوچھا تو عرض کیا

" سالہا سال میں آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی"۔

آپ نے فرمایا:

"کیا اتنے برسوں میں میرے اندر کوئی خلاف سنت بات دیکھی؟"

اس نے کہا "نہیں"

تو فرمایا اصل کرامت یہی ہے۔ مرید بہت ہی خوش ہوا کہ اسے سراغ زندگی ہاتھ آ گیا تھا۔ صوفی کے ہاں بہت سی لازوال عادات عود کر آتی ہیں جیسے وہ

☆ کم کھاتا ہے کم سوتا ہے رات کو اللہ سے دل کی بات کرتا ہے۔

☆ وہ لایعنی گفتگو نہیں کرتا۔

☆ غفلت والے ماحول سے بچتا ہے۔

☆ تقابل ادیان کے سلسلے میں دیکھیں تو کسی بھی سکول آف تھاٹ میں تصوف کو شریعت سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور صوفی ان دونوں رُخوں دونوں رنگوں میں ہی رنگا ہوتا ہے۔

☆ دین حنیف کے ضوابط کو روحانی راستوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا بلکہ دل میں اللہ والی چاہ پیدا ہو جائے تو شریعت پر عمل آسان ہو جاتا ہے اس لیے صوفی بے عمل نہیں ہوتا اس کے قول و فعل سے شب و روز سے بے دینی نظر آ ہی نہیں سکتی صوفی کو فرائض کی ادائیگی میں مسرت بھی ملتی ہے اور محبت بھی۔ ہمارے بابا جی فرمایا کرتے تھے۔

"نماز کی محبت اور ہے محبت کی نماز اور ہے۔"

اللہ جل شانہ سے خلوص دل سے مانگی ہوئی دعا ہے کہ مساجد میں محبت کی نماز پڑھنے والے نمازیوں میں اضافہ ہو۔ اگر کسی حد تک ہی سہی ایسا ہو جائے تو نمازی سوچیں گے کہ جہاں کی محبت نا ملے محبت کا جہاں مل جائے تو سمجھیں گے اک لاثانی زندگی کا سرا ہاتھ آ گیا یہی سرا سراغ زندگی ہے۔

اللہ جل شانہ سے تعلق اپنی ذمہ داریوں سے فرار قطعاً نہیں تاریخ بتاتی ہے کہ سلاطین امراء اور رؤساء ایسے ایسے گذرے جن کا اپنے مالک کے ساتھ لازوال تعلق مثالی تھا اس سے پہلے صحابہ کرام بھی ایسے تھے کہ دن کو گھوڑوں کی پیٹھ پر رات کو مصلے پر ہوتے کہ اللہ سے محبت دنیا چھوڑنے کا درس نہیں دیتی خود ختم المرسلین نے تجارت کی ایک استادِ مکرم کی حیثیت سے ایک ہادی برحق کی حیثیت سے اور ایک سپہ سالار کی حیثیت سے اُن کے مقام کو غیر مسلم قوموں نے بھی سراہا اور پھر اللہ جل شانہ سے اُن کا تعلق تو سب سے بڑھ کر سب سے فزوں تر تھا ابھی ماضی قریب میں اشفاق صاحب (مرحوم) تھے۔ اردو سائنس بورڈ کے چیئرمین تھے اور اللہ والے بھی کمال کے تھے اُن کے قریبی حلقے کہتے ہیں کہ وہ درویش اور آفیسر کے

درمیان کہیں معلق رہ گئے تھے مگر وہ تصوف اور کرسی دونوں کو نبھاتے رہے اس طرح اور بہت سے اللہ والے ہیں۔

جو بڑی پوسٹ پر رہے مگر اللہ سے تعلق بھی مثالی تھا سراغ زندگی پا جانا سب سے آسان اور سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ جو بھی اس کا پتہ حاصل کرنا چاہے اُسے بہت سے تجربات میں سے گذرنا ہوگا جن میں یہ چند جہات بھی شامل ہیں:

☆۔ زندگی کی حقیقت کو پا لینے والا اگر دعا کرے گا تو اسے قبولیت کا یقین ہوگا اگر اسے قدرت والا توبہ کی توفیق دے وہ توبہ قبول ہونے کی قوی امید رکھے گا۔

☆۔ اگر کوئی چاہنے والا دل سے استغفار کرے گا اور اپنے مالک کی شان کی طرف دیکھ کر ایسا کرے گا اور ظاہر ہے اگر وہ صاحبِ دل ہے یہ 2 شرائط بھی پوری کرے گا تو اپنے محبوب حقیقی سے مغفرت کے خزانے پا لے گا اور اس میں کوئی شک نہیں اگر وہ شکر کرے گا تو اضافے رحمتیں اور برکتیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

☆۔ سراغ ڈھونڈنے والے مصیبت کے وقت بھی تحمل سے کام لیتے ہیں شکوہ اور شکایت کرنے والے مقبول عبادات بھی قبولیت کا شرف کھو بیٹھتی ہیں۔

☆ ڈھونڈنے والے جانتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کا ایک فرشتہ روزانہ آسمان دنیا پر یہ ندا کرتا ہے۔

– موت کے لیے اولاد پیدا کرو۔
– برباد کرنے کے لئے مال جمع کرو۔ تم کماؤ گے بھی اجاڑو گے بھی یہ مال تمہارے پاس سدا نہیں رہے گا۔
– تباہ ہونے کے لئے عمارتیں کھڑی کرو (قربِ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عرب کے بدو دنیا کی بلند ترین عمارتیں کھڑی کریں گے) دنیا کی بلند ترین عمارت برج الخلیفہ اسی کی مثال ہے۔ جسے دیکھ کہ سعودی عرب نے اس سے بھی Talest عمارت کھڑی کرنے کے لئے تعمیر شروع کر دی۔ دبئی والوں نے بھی برج الخلیفہ سے اونچی عمارت کی تعمیر شروع کر دی سعودیہ والوں نے اپنے ٹاور کی تعمیر روک دی تو U.A.E والوں نے بھی روک دی اک دوسرے سے اعمال اخلاق کردار اور سنت کی پیروی میں برتری حاصل کرنے کا جذبہ رکھنے والے ریت سیمنٹ اور بجری میں اک دوجے سے برتری کے خواہاں ہیں کیا یہی وہ مسلمان ہے جسے شاعر مشرق نے اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی کا مشورہ دیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ من کی دنیا میں افرنگی کا راج نہیں ہوتا من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق سے معمور ہوتی ہے

☆۔ امن اور عافیت کی تلاش ہی سراغ زندگی ہے۔ اس دنیا میں ہی سچے دین کا رختِ سفر لے کر اللہ کے سچے دوست چلتے ہیں یہی دنیا دار العمل ہے عبادت کی جگہ

ہے اور اللہ کے سچے دوستوں کے لیے تجارت والی جگہ ہے کہ جنت میں تو اس طرح کی تجارت اور رونے والی آنکھ موجود ہی نہ ہوگی نا ہی وہاں وہ دل ہوگا جس کی تہہ میں سے وچھوڑے کی ہوک اُٹھے گی کہ جنت میں درد وغم رنج والم ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گے۔

☆- راستہ تلاش کرنے والا متلاشی ہوتا ہے وہ عمل میں کمزوری نہیں دکھاتا وہ اس بات کو سمجھتا ہے کہ میرے پاس جو مال ہے یہ اُسی کا دیا ہوا ہے اس میں سے جتنا محبوب حقیقی کی راہ پر دوں گا اتنا ہی اپنے مالک کے قرب کو پالوں گا اور جو اپنے مال کو صرف اپنی منفعت کے لئے استعمال کرے گا اوّل تو وہ پیار کی راہ کا راہی ہی نہیں اُسے شہ رگ سے قریب رہنے والے مالک کا ایڈریس نہیں ملے گا کہ مالک کو اس کے مال کی ضرورت ہی نہیں جو ابابیل سے اور مچھر سے اپنے دین کا کام لے سکتا ہے وہ کسی اور مخلوق کی ڈیوٹی بھی تو اپنی رضا والے کام کے لئے لگا سکتا ہے۔ ہم زندگی کے راز کو جاننے کی کوشش نہیں کریں گے تو وہ کوئی اور قوم پیدا کرے گا جو اس کام کو سرانجام دے اگر ہم من حیث القوم زندگی کی اصل راہ کو تلاش کرنا چاہتے ہیں یا کسی فرد کی یہ خواہش ہو تو اک بات یاد رکھنا۔

☆- کبھی الفاظ پر نا جانا کہ انھیں ادا کرنے والی زبان تو بس اک پردہ ہے کاش تو میں یا افراد اس زبان کے پیچھے بھی دیکھ سکتے تو پتہ چلتا کہ اکثر راہنما رہزن ہیں مشیر وزیر بھی چہروں پر خول لیے پھرتے ہیں۔

☆- لوگ مہر بلب نا رہیں تو منزل ملے ہونٹوں پر لگے تالے توڑنا ہوں گے۔ یہ کیسے ہوگا؟ اس کے لئے کتاب دوستی کو چننا ہوگا سچل محبوب کی مان کر چلنا ہوگا۔ کتاب ساتھ ساتھ رہے گی تو ترقی کی سیڑھیاں چڑھتے جائیں گے۔ کتاب شعور عطا کرتی ہے منزل کا راستہ دکھاتی ہے کتاب راستہ دکھا سکتی ہے اس پر چلا نہیں سکتی۔ عمل راستے پر چلائے گا۔ ہماری آنکھ بھی تو اک پردہ ہے یہ پردہ ڈال سکتی ہے پردے کو پیچھے نہیں ہٹا سکتی۔ محبوب حقیقی کو اپنا بنا لیا تو کسی روز آنکھوں کے سامنے سے اک پردہ سرک جائے گا چیزوں پر سے پردے اتارنے کے بجائے خود پر سے پردے اتار پھینکو اس سے کیا ہوگا؟ چیزوں پر سے پردے خود بخود اُتر جائیں گے تب چہروں سے پردے اُتریں گے ہم ساری عمر مقفل پھرتے رہتے ہیں اور یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس قفل کی چابی تو ہمارے اپنے اندر تھی لوگ صدیوں سے خزانوں کی تلاش میں ہیں حالانکہ اصل خزانہ (ایمان اور یقین۔ سراغ زندگی کا پتہ) تو بندے کے اندر ہے بس اسے دریافت کرنے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆

پھر مرا واحد حوالہ شاعری رہ جائے گی

یادش بخیر بچوں کے رسائل پڑھتے پڑھتے جب جوانی کی دہلیز پر پہنچا تو آغا شورش کاشمیری کے ہفت روزہ ''چٹان'' سے دوستی ہوگئی جو میرے والد گرامی، پشتو، فارسی اور اردو ادب کے عالم اور صاحب مطالعہ شخصیت آغا جی سید دلاور شاہ (مرحوم و مغفور) منگوایا کرتے تھے۔ مجھے چٹان میں شورش کاشمیری کی نظم پڑھنا بہت اچھا لگتا، مجھے اب بھی ان کی کئی نظموں کے اشعار یاد ہیں بلکہ ان کی نعت کے کچھ اشعار تو جیسے اب بھی مجھے پُر جوش کرتے اور رکھتے ہیں اور میں اکثر دوستوں کو سناتا رہتا ہوں اور بطور خاص یہ شعر:

رات کے تاریک سناٹوں کی پیداوار لوگ
میکدوں میں سیرتِ خیر البشر پہ نکتہ چیں

.....

چٹان تو خیر شورش کاشمیری کی وفات کے بعد بھی شائع ہوتا رہا مگر وہ بات کہاں..... سو والد (مرحوم) نے منگوانا بند کر دیا تھا اور پھر دیر تک کوئی ہفت روزہ گھر نہیں آیا۔ میں بھی روٹی روزی کے چکر میں اس دوران اپنے گاؤں اکوڑہ خٹک سے پہلے پشاور پھر وزارت اطلاعات و نشریات، اسلام آباد چلا آیا تھا۔ یہ ستر کی دہائی کا وسط تھا جب ایک شام میں گاؤں پہنچا تو والد گرامی کی مطالعہ کی میز پر ایک نیا ہفت روزہ دیکھا۔ یہ محمود شام کا ہفت روزہ ''معیار''، کراچی تھا۔ میں نے چٹان کی سی محبت سے ''معیار'' کو دیکھا پرکھا۔ فہرست مضامین میں مدیر کی کوئی نظم بھی جریدے کے پہلے پہلے صفحات پر تھی۔ وہی صفحہ پہلے کھولا، چٹان کی نظموں کی سی گھن گرج کے علی الرغم بلا کے نرم و گداز اور ملائمت بھرے لہجے کی نظم نے دل کو کہیں بہت اندر سے چھو لیا۔ یہ محمود شام سے میری پہلی ملاقات تھی۔ مجھے ان کا نام بھی اچھا لگا کہ شام سے میرا رومینس بچپن سے چل رہا ہے:

وہ شفق ہو کہ سمندر کہ مرا دل ناصرؔ
شام ہوتی ہے تو ہر چیز لہو روتی ہے

.....

سو شام جی کی تحریروں سے محبت اور عقیدت کا غائبانہ رشتہ ہر گزرتی شام کے ساتھ فربہ ہوتا چلا

ناصر علی سیّد

گیا۔ کالم ہوں یا سیاسی تجزیہ، شعر ہو یا سفرنامہ یا پسِ دیوار زندان کے تجربات اور محسوسات .....شام جی کے قلم نے کاغذ پر جو پھول بوٹے بنائے، وہ ان حساس پڑھنے والوں کے دل کی دھڑکنوں میں بستے رہے جو اس دنیا اور اس سماج کو بہت خوبصورت، پُر امن اور پُر سکون دیکھنا چاہتے ہیں، ہمہ وقت ہونٹوں پر ایک خوبصورت مسکراہٹ سجانے والے شام جی نے اپنے لوگوں کی محبت سے شرابور اور دل سوزی سے لکھی ہوئی تحریروں اور تجزیوں سے امیر شہر کی بے حسی اور ہماری بے بسی کی جو تصویریں بنائیں اور دکھائیں وہ خوب خوب رلاتی رہیں اور اپنی رائیگانی کا احساس اور شدید ہوتا گیا، شام جی کہتے ہیں نا:

ہوا کی ایک لہر سے بدن ہوئے ہیں کرچیاں
پہاڑ جیسے لوگ تھے غبار ہو رہے ہیں ہم

.....

شام جی اونچے ایوانوں کی راہداریوں اور غلام گردشوں میں پنپنے والے بہت سے رازوں کے چشم دید گواہ ہیں اور اپنے لوگوں کو اپنی تحریروں کے ذریعے ہم راز بنانے کا ہنر بھی انہیں خوب آتا ہے۔ لیکن ان کو یہ بھی علم ہے کہ ان کی آواز میں کوئی آواز نہیں ملاتا، اس لئے محرومیوں کے دکھوں نے خون آشام بلاؤں کی صورت یہاں مستقل ڈیرہ ڈال رکھا ہے، اس تکلیف دہ صورت حال کی ایک عمدہ شعری تصویر وہ یوں بناتے ہیں:

بچوں میں تجسس ہے نہ ہمت ہے بڑوں میں
پھیلی ہے اک آسیب کی دہشت سی گھروں میں

.....

شام جی کی نثر کی فسوں کاری اور قاری کو فوراً اپنا طرفدار بنانے کی ہنروری نے تو ایک زمانے کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے پھر ان کی اخبارات اور جرائد کی ادارتی ذمہ داریاں بھی انہیں از حد مصروف رکھتی ہیں۔ یوں بھی وہ اہلِ ایماں کی طرح جہاں میں صورتِ خورشید جینے کے قائل ہیں، ادھر ڈوبے اُدھر نکلے کے پیچھے ان کی غیر ضروری مداخلت پر سمجھوتا نہ کرنے کی فطرت بھی ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کچھ نیا، کچھ ہٹ کے اور کچھ بہتر کرنے کے لئے جن جرأت مندانہ اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے، اپنے مفاد کے کھونٹوں سے بندھی ہوئی مصلحت کیش انتظامیہ نہ برداشت کر سکتی ہے اور نہ ہی اتنا حوصلہ رکھتی ہے، اس لئے محمود شام جی کو کھل کر سانس لینے کے لئے اپنی فضا آپ تشکیل دینا ہوتی ہے۔ ان دونوں ان کے عشق کا مرکز "اطراف" ہے جو گزشتہ ڈیڑھ دو برسوں سے چھائے ہوئے وبا کے موسم میں بھی "انتہاؤں میں رابطہ" کا علم بلند کئے ہوئے پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا بھر کے موضوعات کو دامن میں سمیٹ کر اپنے پڑھنے اور چاہنے والوں تک پہنچتا رہا ہے۔ یہ ساری مصروفیات اپنی جگہ مگر وہ جو غالب نے کہا ہے:

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

.....

محمود شام جی پچیسواں گھنٹہ نکال کر اپنے بہت ہی عمدہ شعر کی چھاؤں میں جا بیٹھتے ہیں، اور پھر شاعری میں بھی وہ اپنے لئے الگ سے راستہ نکالتے ہیں، ان کے شعر کا ذائقہ ہی مختلف ہے،

مضمون آفرینی سے لے کر طرزِ اظہار تک ان کا شعر نئے منطقوں کی سیر کراتا ہے، جن الفاظ اور تراکیب کو کوئی بھی شاعر غیر شاعرانہ کہہ کر چھوتے ہوئے بھی ڈرتا ہے وہ ان کے شعر میں رچ بس کر مانوس ہی نہیں معتبر اور باوقار بھی ٹھہرتی ہیں، مان لیجئے، شام جی اپنے عہد کے حوالے سے شاعری کا نیا بیانیہ ترتیب دے رہے ہیں:

چلتے چلتے کار کے شیشے سے یونہی جھانکنا
اس پہ دعویٰ ہم مزاجِ شہر سے ہیں آشنا

زندگی کتنی حسیں ہے، کس قدر رنگین ہے
پرل کی لابی میں اک دن بیٹھ کر یہ دیکھنا

صبحِ گلشن ، شامِ کلفٹن ، شبِ ملیر
غزلوں کی اک دھنک سی بکھری لگتی ہے

دن تھے کہ تیری کار کا نمبر بھی یاد تھا
اب ہیں کہ ہم کو بھول گیا اپنا نام بھی

....

چھوٹی سکرین پر تواتر سے چلنے والے ایک کمرشل کوٹ کرنے کی اگر مجھے اجازت ہو تو کہوں کہ شام جی کے شعر کے حوالے سے اسی کمرشل کا مکالمہ ان پر بہت فٹ بیٹھتا ہے، "ایسا شعر کون کہتا ہے؟؟" جس کا جواب یہی ہے کہ "جو کوئی نہیں کہہ سکتا وہ ہمیں کہتا ہے" میں نے کہا تھا کہ صرف صحافت ہی میں نہیں، شعر میں بھی ان کا انداز دوٹوک اور جرأت مندانہ ہوتا ہے، اور جب وہ اس طرح شعر کہتے ہیں تو ایک طرح سے اپنی کلاس اور شعر پر اپنی دسترس ظاہر کرتے ہیں ورنہ سہلِ ممتنع اور تغزل سے بھرپور شعر بھی ایک نئے رنگ ڈھنگ سے ان کے ہاں موجود ہیں۔ ذرا دیکھئے کیسا کیسا نیا شعر انھوں نے کہہ رکھا ہے:

اب غزل کہہ رہی ہیں غزلیں بھی
ہم غزل گو بتا کدھر جائیں

دیکھ وہ شامؔ کی آہٹ اُبھری
دیکھ وہ بند ہوئے دروازے

ہم کو پہچان لیا کرتے تھے
یہ ترے شہر کے رستے پہلے

....

وبا کے موسم میں دوستوں نے کیا کیا شعر، غزلیں اور نظمیں کہی ہیں۔ شام جی نے بھی اپنا حصہ ڈالا ہے اور اس وقت جب ابھی کووڈ نائن ٹین کے آداب متعین کیے جا رہے تھے، تو محمود شام کا حالاتِ حاضرہ پر کہا ہوا تازہ شعر موصول ہوا:

عجیب درد ہے جس کی دوا ہے تنہائی
بقائے شہر ہے اب شہر کے اجڑنے میں

....

محمود شام کی ادارت، کالم اور سیاسی تجزیوں کا شہرہ چار دانگ عالم میں گونج رہا ہے، مگر ان کا شعر بھی ان کی پوری توجہ چاہتا ہے اور یہ تو خیر شام جی بھی جانتے ہیں کیونکہ انھوں نے خود ہی کہہ رکھا ہے:

میں نہ ہوں گا تو یہ کالم تجزیے ہوں گے کہاں
پھر مرا واحد حوالہ شاعری رہ جائے گی

☆☆☆☆☆

باقی احمد پوری کی غزل

باقی احمد پوری سے تعلقِ خاطر کو تین دہائیاں ہونے کو ہیں لیکن ان کا ایک شعر ان سے ملاقات سے بہت پہلے میرے حافظے کا حصہ بن چکا تھا:

ساری بستی میں فقط اک میرا گھر ہے بے چراغ
تیرگی سے آپ کو میرا پتہ مل جائے گا

.....

مقبول حسین بخاری المعروف باقی احمد پوری ہمارے دیرینہ دوستوں میں سے ایک ہیں۔ جب ہم لاہور میں نئے نئے وارد ہوئے تو برادر عزیز لطیف ساحل کی وساطت سے باقی ہمارے قریبی احباب میں شمار ہونے لگے۔ اُن دنوں باقی صاحب نئے نئے کویت سے پلٹے تھے اور ان کے تین شعری مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے تھے۔ ''باقیات'' ان کا پہلا شعری مجموعہ تھا جسے شاید ان کا آخری مجموعہ ''یا'' ''کلیات'' ہونا چاہیے تھا۔

باقی احمد پوری ایک ''پیر خانہ'' کے چشم و چراغ ہیں۔ والد صاحب کی گدی نشینی کے بجائے باقی احمد پوری نے حجرۂ غزل کو اپنا الگ آستانہ بنایا۔ احمد پور لمّاں میں پیدا ہونے والے ہمارے اس شاعر نے میٹرک تک وہیں تعلیم حاصل کی اور بعد ازاں خاندان کے ہمراہ شاہدرہ لاہور کو اپنا مسکن بنایا۔

پولی ٹیکنیک کالج ریلوے روڈ سے مکینیکل ڈپلومہ حاصل کر کے کراچی میں مختلف ملازمتیں کیں۔ لاہور سے خط کتابت کے ذریعے استاد ماہر القادری سے غزلوں پر ابتدائی اصلاح لی اور بعد میں کراچی کے قیام کے دوران میں ماہر القادری کی محبتوں سے فیض اٹھایا۔ پھر کویت چلے گئے۔

ہم ان کی شاعری پر نگاہ ڈالیں تو ان کی

اختر شمار

ابتدائی شاعری میں کلاسکی شاعری کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ''باقیات''، ''نقشِ باقی'' اور ''صدرشکِ غزالاں'' کی غزلوں میں حسن و عشق، گل و بلبل زلف و رخسار اور ہجر و وصال کے مضامین نمایاں ہیں۔ یوں ان کی غزل میں وارداتِ قلبی کے ساتھ ساتھ، آس پاس کی ناہمواریاں اور ان پر طنز کی کاٹ بھی ملتی ہے۔

اُس دور کی غزل میں روایتی مضامین، سوز و گداز، شیرینی و سلاست اور نرم لب و لہجے میں گندھے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ''ولی سے اقبال تک'' میں لکھتے ہیں:

''ہر شخص کے لیے ضروری نہیں کہ وہ میر کی طرح غزل لکھے، ہر صنفِ شعر کی طرح غزل، غزل گو کے مزاج کے تابع ہوتی ہے اور یہی اس کی شان ہے۔''

اس رائے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جب باقی احمد پوری کی غزل دیکھتا ہوں تو باقی بلاشبہ اپنا ایک الگ دھیما مگر پراثر لہجہ لیے نظر آتے ہیں۔ بقول غازی علم الدین غزل تتلی کے پروں کی طرح نازک سی چیز ہے اور جب ناپختہ گو شعرا کے ہاتھ میں آتی ہے تو کہیں کہیں بے احتیاطی سے رنگ چھوٹ جاتے ہیں۔''

لیکن باقی احمد پوری کے اشعار میں پختگی کے علاوہ مضمون آفرینی روانی اور چابکدستی انھیں ان کے کئی ہم عصروں سے ممتاز اور نمایاں کرتی ہے۔

جس نے ہر سانس کو تلوار بنا رکھا ہے
وہ تمنا مرے سینے سے نکلتی ہی نہیں

قفس میں قید کرو یا ہمارے پر کاٹو
تمھارے جال میں آئے ہوئے پرندے ہیں

پتھروں سے جُڑے ہوئے شیشے
پتھروں سے بھی سخت ہوئے ہیں

میں کسی بحث میں نہیں پڑتا
جاؤ بابا مجھے معاف کرو

.....

باقی احمد پوری عام زندگی میں شائستہ اور دھیمے مزاج کے انسان ہیں۔ وہ اردگرد کی ناہمواریوں پر طنز بھی کریں تو ان کا لہجہ زیادہ تلخ اور بلند نہیں ہوتا۔ البتہ انسانی رویوں پر کڑھتے ہوئے وہ سچ کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس حوالے سے ان کا خاص اسلوب ہے۔

اکیسویں صدی کا انسان زندگی کی تیز رفتاری اور بے حسی میں اپنی ''اصل'' سے کٹ گیا ہے۔ ہر شخص ایک عجیب سی بھاگ دوڑ اور نفسانفسی کے عالم میں اپنی ذات اور ناک سے آگے نہیں سوچتا۔ حرص و ہوس اور منافقت نے لوگوں میں وفا، خلوص، ہمدردی ایثار جیسی صفات

چھین لی ہیں۔ شاعر ایسے ماحول میں چپ نہیں رہ سکتا:

یہ جو اہلِ زر بنے ہوئے ہیں
سب ہمیں لوٹ کر بنے ہوئے ہیں

شہر جنگل سے کم نہیں لگتا
آدمی جانور بنے ہوئے ہیں

یہ شہر اس واسطے برباد ہوا ہے
اس شہر کا ماحول سیاسی ہے زیادہ

رہزنوں رہبروں نے ٹھانی ہے
اپنے لوگوں پہ ہاتھ صاف کرو

جو ظالم ہے اسے ظالم ہی کہہ دیں
خلوص اتنا بھی لوگوں میں نہیں ہے

ظالموں کو یہی تو ڈر ہے کہ لوگ
دیکھ لیں گے اگر چراغ جلا

.....

تخلیق کار اپنے سماج کا نباض ہوتا ہے اور کوئی بھی جنوئن اور سچا فنکار اپنے عہد سے کٹ کر جی نہیں سکتا۔ وہ معاشرتی ناانصافیوں پر احتجاج سے گریز نہیں کرسکتا۔ ہمارے باقی احمد پوری بھی اپنی شاعری میں زندگی کے آلام کے ساتھ ساتھ عدم مساوات، جھوٹ فریب اور بے حسی پر نوحہ کناں رہتے ہیں۔ اُن کے ہاں بعض استعارے اپنی گہری معنویت کے ساتھ دَر آئے ہیں۔ گھر "عافیت" کا استعارہ ہے مگر گھروں میں جب بھوک افلاس کی تاریکی چھائی ہو تو وہ گوشہ عافیت بھی عذاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ باقی احمد پوری نے گھر بے گھری اور بے دری کو اچھوتے انداز میں ڈھالا ہے جس سے ان کے باطنی احساسات کی شدت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

شام ہوتی ہے تو ہم گھر سے نکل جاتے ہیں
اور کچھ دیر کو غم گھر سے نکل جاتے ہیں

بس کوئی ذوقِ سفر ہے جو لیے پھرتا ہے
ورنہ منزل تو یہی چار قدم ہے ہم کو

دشت و دریا کے یہ اُس پار کہاں تک جاتی
گھر کی دیوار تھی دیوار کہاں تک جاتی

بہت جلدی تھی گھر جانے کی لیکن
مجھے پھر شام رستے میں پڑی ہے

.....

باقی احمد پوری کی غزل میں ایک گداز اور حسنِ ترنم کارفرما ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں نغمگی اور تغزل سے معمور لہجہ بنتا نظر آتا ہے۔

انھیں بلاشبہ زبان و بیان پر بھی عبور حاصل ہے۔ ان کی غزل اپنے باطن میں

سوز و گداز کے ساتھ طنز و احتجاج سے مرصع ہے۔ وہ حکمرانوں یا امیر شہر کی چیرہ دستیوں اور ہوس کاریوں کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں مگر ایسے میں بھی ان کا لب و لہجہ بہت زیادہ تلخ ہونے کے بجائے نرم اور دھیما رہتا ہے۔ شاید یہ ان کے مزاج کا اثر ہے وہ غصّے اور جھنجھلاہٹ کا شکار نہیں ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی موجودہ غزلیہ شاعری نئے پن کے ساتھ روایات کی پاسداری اور احترامِ آدمیت سے مزیّن ہے۔ ان کے مصرعوں کی تراش خراش ایک دلکش ندرت لیے ہوئے ہے۔ زبان و فن کی ریاضت اور سخن سے والہانہ لگاؤ نے ان کی غزل میں گہری فسردگی کے بجائے ایک چاشنی اور رنگینی پیدا کر رکھی ہے۔ وہ نئی زمینوں میں طبع آزمائی کرتے ہوئے اچھوتی فکر کا دیا جلائے دکھائی دیتے ہیں۔

بلاتبصرہ یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جسے ہم قید کرنا چاہتے ہیں
وہی اک لمحہ لمحوں میں نہیں ہے

آج کی شام نہ لوٹ کے جانا میرے ساتھ ہی رہنا
اس سے بچھڑ کر آئی ہے یہ پہلی شام پرندو

فقر سے آشنا جو ہو جائیں
ان کی ٹھوکر پہ تخت ہوتے ہیں

وہ ایسے ڈھونڈنے نکلے ہیں باقی
محبت جیسے رستے میں پڑی ہے

سورج کے نکلتے ہی نکل پڑتا ہے سایا
دیوار کہاں سایۂ دیوار سنبھالے

مرے دریا کبھی دریا بھی ہوا کرتے تھے
اب بھی آواز سی آتی ہے مجھے پانی کی

ان یزیدوں کو خدا کا تو کوئی خوف نہیں
ان یزیدوں کو بہتر سے پریشانی ہے

فلک پہ جن کو ستارے سمجھ رہے ہیں لوگ
وہ چاندنی میں نہائے ہوئے پرندے ہیں

اک دیا شہر میں جلتا ہے اگر تو کیا ہے
اک دیے سے تو چراغاں نہیں ہونے والا

ایک وحشت سی مرے چاروں طرف پھیلی ہے
دشت آباد ہیں اور شہر بیاباں جاناں

حوالہ جات

سید عبداللہ ولی سے اقبال تک لاہور سنگِ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۷ء ص ۹۰

غازی علم الدین تخلیقی زاویے فیصل آباد مثال پبلشرز ۲۰۱۷ء ص ۱۳۷

☆☆☆☆☆

فخر زمان کی غزلیں (راستے کی دھول)

ایک مغربی ادیب نے لکھا تھا کہ کوئی شاعر یا ادیب اُس وقت تک بڑا ادب تخلیق نہیں کرسکتا جب تک وہ اپنے عہد کی سیاسی صورتِ حال سے پوری طرح آگاہ نہ ہو لیکن ہمارے ہاں لکھنے والوں کا سیاسی صورت حال سے تعلق کم کم ہی رہا ہے اس کی بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں لیکن بعض شاعر ایسے بھی ہیں جنھوں نے پوری ذمہ داری اور آگاہی سے اپنے اردگرد کی صورتِ حال کو اپنے شعری تجربات میں ڈھال کر اعلیٰ درجے کی شاعری کی، جن میں سرفہرست فیض وفراز اور غالب کا نام لیا جاسکتا ہے۔

ہم اگر اپنی بہتر سالہ قومی تاریخ پر نظر ڈالیں تو جو معاشرتی توڑ پھوڑ معاشی لوٹ کھسوٹ ہوئی اور ایک سیاسی ابتری رہی نظام اور اداروں کی شکست و ریخت اور ریاستی جبر نے جس طرح سے لوگوں کی زندگیوں کو اذیتوں سے دوچار کیا وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے اس حالت نے ہر حساس دل کو بری طرح متاثر کیا اس طبقاتی کشمکش نے ہمارے نئے لکھنے والوں کو روایت سے ہٹ کر لکھنے پر مجبور کیا اور اس سسٹم اور نظام کے خلاف اور بدلتی ہوئی اقدار کے خلاف ایک مزاحمت پیدا ہوئی بعض لوگوں کے ہاں اس کا اظہار براہ راست ہوا اور بعض کے ہاں زیریں سطح پر اس مزاحمت کی لہریں نظر آئی ہیں مزاحمت کا براہ راست یا نمایاں اظہار ہمیں نظم نگاروں کے ہاں زیادہ نظر آتا ہے ہمارے ہاں زیادہ شعرا غزل گوئی کی طرف مائل ہیں اور غزل کے اپنے تقاضے ہیں، جس کی بنا پر مزاحمت غزل گو شعرا کے ہاں اشاریت اور ایمائیت کی شکل میں موجود ہے۔

فخر زمان کا تعلق ان لکھنے والوں میں ہے، جو لکھاری کے ساتھ ایک سیاستدان بھی ہیں، جس کی بنا پر وہ اپنے معاشرہ کے مسائل سے براہ راست جڑے ہوئے ہیں انھیں معاشرتی اور سماجی مسائل کا ادراک براہ راست ہے اس لیے ان کا تخلیقی تجربہ دوسرے لکھنے والوں سے ذرا مختلف ہے۔ اُردو، پنجابی اور دیگر علاقائی زبانوں کے ادب کے علاوہ ان کی نگاہ

شفیق احمد خان

بین الاقوامی لٹریچر پر بھی ہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کسی ایک صنفِ ادب کو اپنا ذریعہ اظہار نہیں بنایا بلکہ ڈرامہ، ناول، شاعری، سفرنامہ اور دیگر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اگرچہ ان کا زیادہ تر کام پنجابی زبان میں ہے اور وہ پنجابی زبان کی ترقی کے لیے ایک عرصہ سے عملی جدوجہد میں بھی مصروف ہیں لیکن اُردو زبان سے بھی ان کا رشتہ اُسی طرح مستحکم ہے۔

''راستے کی دھول'' فخر زمان کی غزلوں کا مجموعہ ہے غزل ایک ایسی صنف ہے جس میں آپ کسی مربوط فکر کو بیان نہیں کر سکتے اگرچہ فخر زمان کے ہاں ایک نظریاتی اساس اور منظم فکر موجود ہے، جس کے لیے غزل کا پیکر اتنا مناسب نہیں ہے اور انھوں نے اپنے نظریات وخیالات کو اس طور غزل کے پیکر میں ڈھالا ہے کہ اس کی خاصیت بھی متاثر نہ ہو اور وہ اپنی بات بھی کہہ دیں، جس کی بنا پر وہ ایک ایسی غزل لکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو ہماری روایتی غزل سے ذرا مختلف ہے ان کی ڈکشن اور اسلوب اپنی انفرادیت لیے ہوئے ہے۔

ان کی غزلوں میں جو استعارے آئے ہیں وہ ہمارے سماج کی سائیکی فرد اور معاشرے کی تلخیوں سے بُجھے ہوئے ہیں۔

کشکول، خیرات، پتھر، انصاف، دیوار، گلشن، پھول، چراغ، مکاں، خوف اور بہت سے ایسے لفظ جو استعاروں کی شکل اپنی نئی معنویت ہم پر کھولتے ہیں۔

ہمارا معاشرے ان بیتر سالوں میں ایک زندان کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ زندگی فرد کے لیے اجیرن ہوگئی ہے ہم ہر لحہ نقصان اٹھا کر بھی کوئی اُمید کا پہلو تلاش کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

دیوار سے گو اینٹ کھسک کر پڑی سر پر
صد شکر کہ روزن کوئی زنداں میں کھلا ہے

.....

اب دیکھے کس راہ میں دیوار بنے گا
ڈھلوان پہ اک سنگ گراں چل تو پڑا ہے

.....

سر پھوڑ کے دیوار سے مر جائے گی آخر
گنبد میں بھٹکتی ہوئی اک ایسی صدا ہوں

.....

جو اختلاف کرے اُس کو دار پہ کھینچو
دکھائے آنکھ تو دیوار میں اُسے چن دو

.....

جس راہ کی دیوار گراتے ہوئے آئے
آ مل کے اُس راہ میں دیوار بنیں ہم

.....

میں نے فریاد کی زنجیر ہلا دی کچھ اور
اُس نے پھر جسم پہ دیوار چڑھا دی کچھ اور

.....

نہیں فخر وہ منزل کے نشاں سامنے لیکن
حالات کی دیوار بھی رستے میں کھڑی ہے

.....

دیوار کی تعمیر میں شامل تھا مرا خوں
سائے میں مگر اس کے کوئی اور کھڑا تھا

دیوار اور پتھر ایسے استعارے ہیں جو ہمارے رویوں کی سنگ دلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں ہمارے دل پتھر ہو چکے ہیں اور چاروں جانب روایتوں کی دیواریں پتھر کا استعارہ ان کے ہاں نئے سے نئے معنی لیے ہوئے آتا ہے:

پتھر سے نکل آیا تھا میں جس کو گلی میں
دیکھا تو وہی سانپ مرے سر پہ کھڑا ہے

.....

تمام شہر کے ہاتھوں میں آج پتھر ہیں
صلیب فخر اٹھا کر کسے گزرنا ہے

.....

یا خدا لوگ بنائے تھے اگر پتھر کے
میرے احساس کو شیشہ نہ بنایا ہوتا

.....

وہ پہلے اندھے کنویں میں گرائے جاتے ہیں
جو سنگ شیشے کے گھر میں سجائے جاتے ہیں

.....

بڑا ہی زور ہے اس بار مینہ کے قطروں میں
کہ پتھروں پہ بھی گھاؤ لگائے جاتے ہیں

.....

کچھ اس طرح تھا راہ میں پتھر پڑا ہوا
ٹھوکر لگی مجھے تو میں ماتھے کے بل گرا

.....

اس سنگ دل اور بے رحم معاشرہ نے ہر فرد کے راستے میں ایسے پتھر پھینک رکھے ہیں کہ اسے گام گام ٹھوکریں لگتی ہیں اور لوگ ان حالات کی ٹھوکروں سے آئے دن ماتھے کے بل گرنے پر مجبور ہیں۔ کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہے۔

ہمارے حکمرانوں کی نااہلیوں نے ملک کو قرضوں کے بوجھ تلے دبا دیا ہے ہماری حکومتوں نے ان بہتر سالوں میں اقوامِ عالم کے سامنے جو گداگری کی ہے اس سے ہماری انا اور غیرت ختم ہو کر رہ گئی یہی وہ قومی رویے ہیں جو نیچے افراد تک منتقل ہوئے فخر زمان نے اپنی غزلوں میں کشکول گداگر، خیرات جیسے استعارے استعمال کر کے ان ناسوروں کی نشاندہی کی ہے:

اس بوڑھے گداگر سے مجھے خوف لگا تھا
اندھا تھا مگر پھر بھی مجھے دیکھ رہا تھا

.....

جو بھیک ملی بانٹ دی اوروں میں اُسی وقت
اور شام کو خالی مرا کشکول پڑا تھا

.....

جس گر سے نہیں فخر کو خیرات کی اُمید
کشکول لیے پھر بھی اُسی در پہ کھڑا ہے

کس کس کو دکھاتے رہیں جیبوں کے یہ سوراخ
ہر موڑ پہ کشکول لیے لوگ کھڑے ہیں

.....

پھر آج ایک ضرورت نے سر جھکا ڈالا
پھر آج ہاتھ میں کشکول لے کے میں نکلا

.....

کس کس کے ہاتھ اپنا لہو بیچتا رہوں
اُجرت بھی میرے واسطے خیرات ہو گئی

.....

گداگروں کے دیس ہم آ گئے ہیں دوستو
صدائیں ہونٹ ہونٹ پر پھٹی ہوئی قبا قبا

دور سے میری تہی دامنی جب اُس پہ کھلی
میں جو گزرا تو گداگر نے صدا دی کچھ اور

.....

ایسے ان گنت اشعار ہیں جو کشکول، گداگر اور خیرات کے استعاروں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ وقت کی سنگینوں نے انسانوں سے انسانیت چھین لی ہے اس معاشرہ نے انسانوں کو خلاؤں میں معلق کر دیا ہے ان کی بنیادی صفات کہیں گم ہو کر رہ گئی ہیں:

زمیں سے دور ہے اور آسماں سے بیگانہ
خلا میں آج کا انسان ایسے لٹکا ہے

.....

لمحوں کا بھنور چیر کے انسان بنا ہوں
احساس ہوں میں وقت کے سینے میں گڑا ہوں

.....

انسان کو جینے کا سلیقہ نہیں آتا
اور آپ کو انسان کی عظمت کی پڑی ہے

.....

فخر زمان کی شاعری میں اگرچہ زیادہ تر مضامین معاشرتی اور اجتماعی حوالے سے نظر آتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت سی غزلوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو خالص انفرادی اور داخلی واردات کے حامل ہیں جن میں روایت کی جھلک بھی موجود ہے اور جذبے کی شدت بھی اور کہیں کہیں خوبصورت امیجز کو بھی برتا گیا ہے:

فضا میں آج رات کیوں ہے درد سا رچا رچا
ستارے زرد زرد ہیں تو چاند ہے بجھا بجھا

ملال کیا جو کر دیا ہے تو نے آ کے گل اسے
اداسیوں کا زہر ہے فضاؤں میں گھلا گھلا

.....

مجھ کو ہوتا نہ تری وعدہ خلافی کا گلہ
تو نے اک بار ہی وعدہ جو نبھایا ہوتا

.....

تجھ کو منظور تھا گر ترک تعلق مجھ سے
اتنی تحقیر سے دامن نہ چھڑا لیا ہوتا

.....

مانوس سی آہٹ مرے کانوں میں پڑی ہے
دروازہ کھلا رہنے دو شاید کوئی آئے

.....

شب گزرے گی جانے کیسے
دل تو شام سے بیٹھا جائے
دن کو تو کچھ اور بھی غم تھے
رات پڑی تو تم یاد آئے

.....

ایسی کیفیات و جذبات شاعر کو اپنے ماحول کی تلخیوں سے کچھ دیر کے لیے نجات دینے میں معاون ہوتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے وہ زندگی کے تلخ مسائل سے نکل کر ایک اور دنیا آباد کر لیتا ہے فخر زمان کی غزلوں کا مجموعہ ''راستے کی دھول'' ان کی مختلف تخلیقی جہتوں میں ایک نئی سمت کی نشاندہی کرتا ہے ان کے تخلیقی سفر میں ایک نیا پڑاؤ جو ان کے نظریات و افکار اور تخلیقی امکانات میں ایک نیا در کھولتا ہے۔

☆☆☆☆☆

اختر رومانی اور درویشوں کی بیٹھک

یہ کئی برس پہلے کی بات ہے جب لاہور میں چند درویشوں کی بیٹھک ہوا کرتی تھی۔ یہ چند شاعر تھے جن میں عبدالحکیم وفا، شہزاد احمد، اظہار شاہین، علامہ بشیر رزمی اور اختر رومانی شامل تھے یہ لوگ ہر ماہ باری باری ون ڈش پارٹی کرتے تھے اور جب قرعۂ فال جناب اظہار شاہین کے نام نکلتا وہ مجھے بھی اس پارٹی کا حصہ بنا لیتے تھے۔ یہ سارے لوگ ہی ادب سے جڑے ہوئے اور بزرگ ہوتے ہوئے بھی اپنے سے جونیئرز کو عزت دینے والے تھے۔ ان میں شہزاد احمد جو ایک نامور شخصیت تھے بعض اوقات ہمارے گھر آتے تو شاعر درویش بشیر رحمانی (میرے والد) کے ساتھ فرشی نشست پر بیٹھ کر ہی فش پارٹی میں شامل ہو جاتے تھے۔ اظہار شاہین تو ایک خوبصورت شاعر میرے بزرگ دوستوں میں شامل تھے۔ عبدالحکیم وفا اپنی جگہ ایک اعلیٰ شاعر اور سلجھے ہوئے انسان تھے۔ علامہ بشیر رزمی ماہرِ علم عروض واستاد شاعر تھے اب بھی ہیں۔ جب کہ اختر رومانی جدید طرز اظہار کے شاعر ہی نہیں بہترین انسان بھی تھے وہ اکثر اپنے دوستوں اور خصوصاً نوجوانوں کو مولوی بھی کہہ کر پکارتے تھے ہمارا ٹھکانہ بھی مہینے میں دو بار علامہ بشیر رزمی اور عبدالحکیم وفا صاحب کا مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ وفا صاحب کے مشاعرے میں جب ایک ماہ میں نہیں گیا تو رومانی صاحب بڑی محبت سے بولے، ''بھئی پچھلے ماہ نہیں آئے تو اب دو غزلیں سنانا پڑیں گی''، یہ بہت کمال کے لوگ تھے۔

اختر رومانی خلوص ومحبت کا پیکر تھے، جہاں تک اُن کی شاعری کا تعلق ہے تو انھوں نے زندگی کی بہت سی تلخیوں اور حقائق کو اپنی غزل کا حصہ بنایا ہے، محبتوں کے جذبات اُن کے ہاں خال خال ہی ملتے ہیں انھوں نے اپنے اکلوتے شعری مجموعے ''ان کہی کا عذاب'' میں غزل کو ذریعۂ اظہار بنایا ہے اور اس صنف سخن میں نہ صرف جدید طرزِ تحریر کو اپنایا ہے بلکہ روایت سے بھی تعلق قائم رکھا ہے بقول علامہ بشیر رزمی، ''غزل کا دامن اُس قدر وسیع ہو چکا ہے کہ اس میں ہر قسم کے خیالات اور احساسات کو سمونے کی صلاحیت ہے۔ انھیں اپنی شعر گوئی پر ایمان کی حد تک یقین بھی ہے اور فخر بھی۔ اُن کی یہ صلاحیت اُن کے ایک ایک شعر سے جلوہ گر ہے۔ وہ قوت متخلیہ کو بے لگام نہیں ہونے دیتے۔ اُن کی نظر ایک منظر پر نہیں ٹھہرتی، نئے مناظر کی تلاش میں جستجوئے پیہم، محوِ پرواز رہتی ہے۔ وہ نئے مضامین کی تلاش اور پھر انھیں مستحسن انداز میں شعر کا لباس پہنانے پر قدرت رکھتے ہیں۔''

علامہ صاحب کے اس قابلِ قدر اعتراف کے بعد آیئے اب جدید طرز احساس سے مزین

محمد نوید مرزا

جناب اختر رومانی کے چند شعر دیکھتے ہیں:

خیال اپنا کہیں تھا، قدم پڑے کہیں اور
چلے تمھاری طرف تھے پہنچ گئے کہیں اور

جب درمیانِ بندہ و مولا رہے نہ کچھ
ایسی بھی کیفیت سے گزرتا ہے آدمی

ذات کے کشف سے دیوار انا ٹوٹ گئی
اُن کا کیا ہو گا جنھیں دعویٰ یکتائی ہے

صحرا و دشت شہر کی سرحد میں آ گئے
یعنی کہ آبلہ کوئی اب پھوٹتا نہیں

اور پھر اُن کی مشہور غزل کے دو شعر:

کماں سے تیر جو چھوڑا تو پھر ہوا کا ہوا
زبان سے لفظ نکالا تو پھر ہوا کا ہوا

جما کے پاؤں زمیں پر رکھو کہ دیکھا ہے
گرا جو شاخ سے پتا تو پھر ہوا کا ہوا

.....

اختر رومانی کی غزل گونج دار ہے اور اُس میں ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔ رومانی صاحب نے زندگی کا طویل عرصہ دیارِ غیر میں گزارا اور اُن اولین کلام ضائع یا گم بھی ہو گیا تھا۔ عرب امارات میں رہتے ہوئے روزگار کی تلاش نے انھیں وقتی طور پر شاعری سے کنارہ کشی پر بھی مجبور کر دیا تھا لیکن اُن کا جتنا کلام بھی ہمیں میسر ہے وہ اس بات کی گواہی دیا ہے کہ وہ ایک خاص اسلوب کے شاعر تھے جنھوں نے اردو غزل کو خوبصورتی سے سنوارا اور سجایا ہے۔ اس حقیقت کی طرف جناب شہزاد احمد نے کیا خوب اشارہ کیا ہے، ''اصناف سخن میں اسے صرف غزل پسند ہے میں نے اس سے کبھی نظم، رباعی، مثنوی نہیں سنی۔ غزل کے ساتھ یہ تعلق خاصر ایک روایت کے طور پر نہیں اپنایا گیا، غزل ایک طرف تو پورے معاشرے کا اظہار ہے اور دوسری طرف فرد کے رُجحانات کو بھی بیان کرتا ہے، اس باعث غزل میں اپنا انداز اور اپنی انفرادیت قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ اس شعلے کی طرح ہے جو چراغ سے نکلتا ہے اور پھر اپنے اردگرد کو منور کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی چراغ کی روشنی میں جب معاشرے کا مطالعہ کیا جائے تو وہ شے اُبھرتی ہے جسے شاعر کا اسلوب خاص کہا جاتا ہے۔ اختر رومانی کا بھی ایک اسلوب خاص ہے اور اس کی غزل کے مطالعے سے یہ انداز کیا جا سکتا ہے کہ یہ اس کی غزل ہے۔ خواہ اس کا نام کہنے سے رہ گیا ہو۔''

شہزاد احمد جیسے نامور شاعر کا جناب اختر رومانی کے لیے بھرپور خراج تحسین اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ رومانی صاحب کی غزل شاعروں کے ایک بہت بڑے جتھے میں اپنے لیے نہ صرف الگ راہ متعین کرتی دکھائی دیتی ہے بلکہ وہ اپنے اسلوب خاص کی روشنی میں تخلیقی اعتبار سے شعری دنیا میں اپنے لیے ایک بڑا مقام بھی حاصل کرتی ہے۔

اس بے بدل شاعر کو فانی دنیا سے تو رخصت ہوئے کم و بیش بیس برس گزر چکے ہیں لیکن ان کا شعری سرمایہ ''ان کہی کا عذاب'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے اور یہ شاعری اچھی اور معیاری غزل پڑھنے والوں کے لیے کسی تحفے سے کم نہیں ہے۔ اللہ پاک اُن کی مغفرت فرمائیں (آمین)

☆☆☆☆☆

روحی کنجاہی بھی چل بسے

امر الٰہی المعروف روحی کنجاہی منشی محمد دین کے ہاں 4 اگست 1938 کو محلّہ کوروٹانہ کنجاہ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول کنجاہ سے اور میٹرک کا امتحان ماڈل سکول لالہ موسیٰ ضلع گجرات سے پاس کیا۔ ایف اے، بی اے اور فارسی فاضل کے امتحانات پرائیویٹ طور پر پاس کیے۔ 1954 تا 1965 تک کوہ نور ٹیکسٹائل ملز فیصل آباد میں کام کیا اس کے بعد کنجاہ کی نامور شخصیت میاں اصغر علی راٹھور کمشنر ریٹائرڈ نے روحی کنجاہی کو پنجاب زرعی ترقیاتی سپلائز کارپوریشن میں بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھرتی کروایا۔ اس ملازمت میں 1968 تا 1986 تک کام کرتے رہے اور اسی دوران لاہور شفٹ ہو گئے اور پھر ساری زندگی ٹاؤن شپ لاہور میں گزار دی۔

روحی کنجاہی بڑے زندہ دل انسان تھے دوستوں کو خط بھی لکھتے تھے اور فون بھی کرتے تھے۔ میرے پاس ان کے ایک درجن سے زائد خطوط ہیں اور متعدد بار فون پر بات چیت کر چکے ہیں۔ اپنی وفات سے ایک ہفتہ قبل بھی فون پر بات ہوئی مگر ان کے ذہنی خواص کام نہیں کر رہے تھے۔ فون پر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے اور ان کے بیٹے نے مجھے بتایا کہ ابو بیمار ہیں ان کا دماغ کام نہیں کرتا باتوں کا بُرا محسوس نہیں کرنا۔ روحی کنجاہی صاحب کو بذریعہ ڈاک اپنی تمام کتب اور اخبار بھیجتا رہا جس کے بدلے میں وہ خط لکھتے تھے۔ ان سے ٹاؤن شپ لاہور میں ان کی رہائش گاہ پر کافی ملاقاتیں ہوئی ہیں تین چار بار کنجاہ بھی آئے ہیں مجھے یاد ہے وہ منیر چشتی کنجاہی کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ ان سے ٹاؤن شپ لاہور میں ان کی رہائش گاہ پر کافی ملاقاتیں ہوئی ہیں تین چار بار کنجاہ بھی آئے ہیں۔

ایک دفعہ المیر ٹرسٹ لائبریری گجرات میں اشرف نازک کنجاہی، منیر چشتی کنجاہی، ظفر ادیب اور بندہ ناچیز اکٹھے گئے اور راستے میں بڑی بذلہ سنجی ہوئی اور لطیفے بھی پیش کیے روحی کنجاہی کو اکثر ٹیلی ویژن پر مشاعرے پڑھنے جاتے اور ہم ٹی وی پر انھیں دیکھ کر خوش ہوتے۔ روزنامہ دن، روزنامہ پاکستان، روزنامہ نئی بات، لاہور میں ان کے قطعات شائع ہوتے

احسان فیصل کنجاہی

تھے تو پڑھ کر اپنائیت محسوس ہوتی۔ روحی کنجاہی کو ساری زندگی لوگ لڑکی سمجھتے رہے اور بہت سارے لطیفے ان سے منسوب ہیں۔ اپنی زبانی بھی روحی کنجاہی صاحب لطیفے اور آپ بیتیاں سناتے تھے لاہور کے مشہور ادبی رسالہ ماہنامہ بیاض، میں مسلسل شائع ہوتے تھے مجھے یاد کہ میری تجویز پر پروفیسر زہیر کنجاہی (مرحوم) نے زمان کنجاہی سے ماہنامہ غنیمت کا خصوصی شمارہ نکالنے کا کہا تو زمان کنجاہی نے روحی کنجاہی نمبر نکالا، جس کا خرچہ زہیر کنجاہی نے برداشت کیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ 2004 میں غنیمت کنجاہی کے عرس کے موقع پر بزم غنیمت کی طرف سے شریف کنجاہی کی سونے کے تاج سے تاج پوشی کی گئی اور تمام کنجاہی شعرا کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا گیا اور اس تقریب میں پروفیسر زہیر کنجاہی اور روحی کنجاہی کی زندگی میں پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ حالانکہ خط و کتابت بہت عرصہ پہلے کی کر رہے تھے 2014 میں ان کی کتاب: غزل غزل زندگی، شائع ہوئی۔ کتاب میں اپنے مضمون میں روحی صاحب نے میرا ذکرِ خیر بھی کیا تھا جو میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ روحی کنجاہی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانے سے کیا تھا اور بعد میں شاعری کی طرف آ گئے اور اردو میں خوب شاعری کی اور بحروں کا استعمال خوب جانتے تھے۔ اپنا منفرد لہجہ رکھتے تھے انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ میں احمد فراز کو ایک عہد ساز شاعر نہیں مانتا۔

یہ بات کوئی چھوٹا آدمی نہیں کر سکتا۔ 2019-20 میں PC ہوٹل لاہور میں ماہنامہ پھول کے زیر اہتمام منعقدہ اہل قلم کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا تو امجد اسلام امجد سے ملاقاتیں ہوئیں تو انھوں نے شریف کنجاہی اور روحی کنجاہی کا ذکر بڑے ادب و احترام کے ساتھ کیا، جس پر مجھے فخر ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔

روحی کنجاہی کی تصانیف میں سمتیں، اردو مجموعہ کلام 1986 میں شائع ہوا اور دوسرا ایڈیشن 1994 میں شائع ہوا۔ 1997 میں ان کا دوسرا شعری مجموعہ اچھے دنوں کی آس میں، شائع ہوا۔ 2011 میں ان کا اردو مجموعہ اشارہ شائع ہوا۔ 2014 میں ''غزل غزل زندگی'' شائع ہوا ان کی ایک کتاب بچوں کے لیے نظمیں ''آنگن کے پھول'' زیر ترتیب تھی۔ طنزیہ و مزاحیہ کلام، قطعات، پنجابی کلام، اردو کلام کے مزید تین مجموعہ زیر ترتیب تھے۔ تالیفات انتخاب میں، بے مثال افسانے اردو کے اٹھاسی سالہ افسانوی ادب 1901 تا 1988 تک کا پچاس شاہکار افسانوں پر مشتمل انتخاب پہلا ایڈیشن 1989 اور دوسرا ایڈیشن 1991 میں شائع ہوا۔ شاہکار مزاحیہ شاعری۔ شاہکار بیت بازی، اُجڑے دیار میں۔ آنسو بہانا یاد ہے۔ تمھیں یاد ہو کہ نہ ہو۔ ذرا وصال کے بعد، مسودے زیر ترتیب ہیں۔ نہ جانے اب کوئی ادارہ انھیں شائع کرتا ہے یا پھر یہ مسودے ردی کی نظر ہوتے ہیں۔

روحی کنجاہی کو ملنے والے اعزازات میں M.A اردو کے لیے اورینٹل کالج لاہور عبداللہ صفوان نے مقالہ لکھا۔ جولائی 1992 میں ناروے کے مشاعرے میں شرکت کی۔ پٹیالہ بھارت میں پنجابی کانفرنس میں بحیثیت مندوب شرکت کی۔ 2004 میں بزم غنیمت کنجاہ کی طرف سے نشان غنیمت ایوارڈ دیا گیا۔ 'بیاض تخلیقی غزل ایوارڈ 2005' اور 30,000 روپے انعام حاصل کیا۔ ماہنامہ بیاض، کی طرف سے خالد احمد لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ اور 50,000 روپے انعام 2014 کو حاصل کیا۔ ادارہ کامرانیاں کنجاہ کی طرف سے 2009 میں شریف کنجاہی ایوارڈ وصول کیا اور ن لیگ کے دورے حکومت میں صدارتی ایوارڈ حاصل کیا۔ روحی کنجاہی کو مشورہ دیا تھا کہ ماہنامہ غنیمت اگر اکرم کنجاہی کو دیا جائے تو کراچی سے پرچہ نکلتا رہے وہ بات مان گئے۔ ماشاء اللہ آج اکرم کنجاہی صاحب سہ ماہی غنیمت رسالہ کراچی سے نکال رہے ہیں۔ کنجاہ میں منیر صابری کی دکان پر روحی کنجاہی سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ منیر صابری کے کلاس فیلو بھی تھے۔

روحی کنجاہی سرزمین کنجاہ کا فخر بھی تھے وہ لاہور میں رہ کر کنجاہ کو کبھی نہیں بھولے اور کنجاہ کے عوام اور ادبی دوستوں نے بھی ان کا احترام کیا ہے، مگر بدقسمتی سے ان کی زندگی کے آخری ایام کچھ صحیح نہیں گزرے بڑے تنگدستی میں گزرے۔ حکومت پاکستان کے کسی ذمہ دار نے ان کی خیریت تک ہیں دریافت کی اور نہ انھیں کوئی مالی معاونت سے نوازا۔ یہ ایک المیہ ہے۔ روحی کنجاہی پر احمد ندیم قاسمی، سید ضمیر جعفری، شہزاد احمد، میرزا ادیب، حفیظ تائب، پروفیسر شیخ ڈاکٹر محمد اقبال، سید مسعود احمد ہاشمی، خالد احمد، ڈاکٹر سعادت سعید، اعزاز احمد آذر، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، پروفیسر زہیر کنجاہی، پروفیسر ناصر بشیر، یعقوب پرواز، الطاف قمر، محمد اشرف شریف، جاوید اقبال رندھاوا، عبداللہ صفون، عمران نقوی، منیر نیازی، شریف کنجاہی، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر سلیم اختر، عطا الحق قاسمی، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر انور سدید، نثار احمد کنجاہی، آفتاب کاوش، سجاد اکبر بخاری، ظفر اقبال کے علاوہ اور بے شمار ادیبوں نے لکھا ہے۔ انھیں اپنے اپنے لفظوں میں خراج تحسین پیش کیا ہے جبکہ منظوم خراج تحسین پیش کرنے والوں میں منیر صابری کنجاہی، پروفیسر زہیر کنجاہی، منیر چشتی کنجاہی شامل ہیں۔ اتنی خوبیوں اور علمی ادبی جہتوں سے مزین شخصیت روحی کنجاہی 8 فروری 2022 بروز منگل ٹاؤن شپ لاہور میں اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ کنجاہی اور گجرات ہی نہیں بلکہ اردو ادب اور پنجابی ادب کو سوگوار کر گئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ روحی کنجاہی کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

''تیرے آنے کا انتظار رہا'' میری نظر میں

رسا چغتائی صاحب کی ادبی اور شعری سرگرمیوں کی بساط کم وبیش نصف صدی کے عرصے پر پھیلی ہوئی ہے۔ زبانی اعتبار سے اُن کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا گراف روز بہ روز بلند سے بلند ہوتا جا رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت غزل گو شعرا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

رسا چغتائی صاحب کی شاعری کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت اُن کے خیالات کی سنجیدگی، ذہنی ٹھہراؤ اور شعری اعتدال ہے۔ اُن کی شاعری میں تصور پرستی اور حقیقت نگاری کا ایسا امتزاج ہے جیسے سچے موتیوں میں آب کی جھلک، اُن کی شاعری ایک ایسی دل پزیر قوسِ قزح کی طرح ہے، جس میں بارش کے بعد ساتوں رنگ ایسے نکھر آتے ہیں کہ ہر آنکھ اُن کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اُن کی شاعری ہمارے احساسات کے لطیف پردوں سے ٹکراتی ہے ۔ اُن کی شاعری میں ایک خاموش تھپتھپاہٹ، ایک ہلکی بے داری اور مدھم جذبات کی شدید فراوانی رواں دواں دکھائی دیتی ہے ۔ تسلسل، ربط اور احساسات کی نزاکت اُن کی شاعری کی چند خصوصیات ہیں۔

رسا چغتائی صاحب کی شاعری پر یہ جملے میں نے ایسے ہی نہیں لکھے بلکہ حال ہی میں شائع ہونے والی اُن کی کلیاتِ شعری ''تیرے آنے کا انتظار رہا'' کو پڑھنے اور اُن کی شاعری کو سمجھنے کے بعد لکھے

رومانہ رومی

ہیں ان کی یہ کلیات کراچی آرٹس کونسل کے تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے تفصیلی مطالعہ نے نہ صرف رسا صاحب کی شعری پرتوں کو جاننے کا موقع دیا بلکہ بہت سے خوبصورت اشعار سے دوستی بھی ہوئی۔

رسا چغتائی صاحب کی شاعری میں جہاں نرمی ہے وہاں شگفتگی اور دل پزیری بھی ہے دراصل ان کا مشاہدہ فطرت بڑا عمیق ہے اور شعر گوئی کے طویل تجربے اور اظہار و ابلاغ کے فن پر قدرت حاصل ہونے کی وجہ سے وہ اس کا اظہار بڑی چابکدستی سے کرتے نظر آتے ہیں جیسے:

باہر ایک تماشا ہے
اندر کی حیرانی کا

.....

شہر میں جائیں تو لوگوں کا ہجوم
اور گھر جائیں تو سناٹا ملے

.....

آدمی کس کمال کا ہو گا
جس نے تصویر سے نکالا مجھے

.....

کہیں دیوار کے رشتے ملیں گے
کہیں دیوار کا جھگڑا ملے گا

.....

چُن رہا ہوں پلکوں سے راستے کے کانٹوں کو
قرضِ آدمیت ہے فرضِ آدمیت کیا

.....

آج پہچانتا نہیں کوئی
میری آواز سے مرے گھر میں

.....

کیسے زندہ ہیں اس گلی کے لوگ
راہ چلنا بھی اِک ہُنر ہے یہاں

.....

تاریخ بتائے گی کہ ہم اہلِ قلم ہی
آزادیٔ انساں کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں

.....

زندگی ہوتی ہے کیا عمرِ رواں کیا چیز ہے
وقت کیا ہے وقت کی تعبیر کیا ہے کیا نہیں

.....

مندرجہ بالا اشعار میں روایت کی مکمل پاسداری کے ساتھ رسا صاحب نے جدیدیت کا رنگ بھی ڈالا ہے اور اسی لیے اشعار کا معنوی کینوس بھی بے حد وسیع ہو گیا ہے جو اُن کی فکر اور فنی پختگی اور شعری ریاضیت کا نتیجہ ہے۔

رسا صاحب کی شاعری میں گہرائی اور گیرائی دونوں کارفرما نظر آتی ہے اور شاید ان ہی کی بنا پر وہ غم کی عکاسی بھرپور طریقے سے کر پاتے ہیں یہ غم ذاتی بھی ہو سکتے ہیں اور

کا نکاتی بھی۔ اگر میں یوں کہوں کے رسا صاحب کی غزلیں اُن کے ذاتی تجربات کا عکس ہیں تو شاید غلط نہ ہوگا۔ اُن کی غزلوں میں موجود غم کا اثر رسمی اور سطحی نہیں بلکہ محرک اور جاندار ہے کیوں کہ انھوں نے زندگی کی جن منزلوں کو طے کیا ہے اُنہی کا غبار چاندنی بن کر اُن کی غزلوں میں اُبھرتا ہے۔

رسا صاحب کے اشعار میں لفظوں میں بندش، تراکیب خراش، مضمون کی شادابی اور شیرینی مومن اور غالب کی یاد تازہ کرتی ہے۔ رسا صاحب تراکیب کی چستی برجستگی اور رنگینی کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی کے گُر سے بھی واقف ہیں وہ حسرت اور مومن کی طرح تراکیب کی رنگینیاں پیدا کرتے ہیں مگر اس شعری فضا میں اُن کا اپنا لہجہ گم نہیں ہوتا۔

رسا صاحب، اقبال کی طرح فلسفۂ زندگی کے شاعر نہیں بلکہ وہ زندگی کے مسائل کے شاعر ہیں۔ اُن کا عشق ماورائی نہیں بلکہ مادّی ہے، جس میں اُن کی جیتی جاگتی، ہنستی گاتی، خوب صورت حسین پیکر محبوب کا جلوہ نمایاں ہے۔ یہ جلوے نہ صرف وہ خود دیکھتے ہیں بلکہ رقیب کو بھی دکھاتے ہیں۔

صرف مانع تھی حیا بندِ قبا کھلنے تلک
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

.....

شاخِ بدن سے لگتا ہے
مٹی راجستھانی ہے

.....

عشق کارِ پیمبرانہ ہے
جس کو چھونا مثال کر رکھنا

.....

رسا چغتائی صاحب جیسے حساس، شریف النفس، سلیم الفطرت، حلیم الطبع اور انسان دوست افراد معاشروں کی تہذیب وتمدن کا جھومر ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری ایک سچے مخلص اور باہنر شاعر کی شاعری ہے اُن کا طرز احساس اور ذہنی رویہ آج کے باخبر، باشعور، حساس اور ذمہ دار انسان کا رویہ ہے۔ انسان اپنے دکھ اور سکھ کے ساتھ ساتھ دوسروں کے دکھ اور سکھ کو کس طرح محسوس کرتا ہے اور اس کا ٹکراؤ سماج اور کائنات سے کس طرح ہوتا ہے۔ رسا صاحب کی شاعری اس اجمال کی تفصیل ہے۔

آخر میں اُن کے ایک شعر پر اپنا مضمون ختم کرتی ہوں کہ واقعی غزل کی تاریخ رسا چغتائی کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوتی کہ:

جب بھی ذکرِ غزل چھڑا، اُس نے
ذکر میرا بطورِ خاص کیا

☆☆☆☆☆

''زینت آئندہ'' انتظار حسین

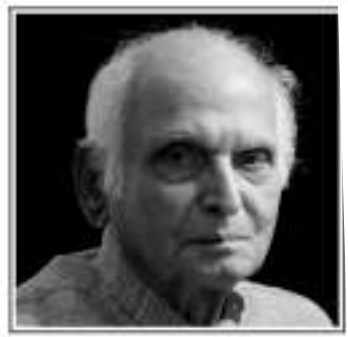

یہ دنیا ایک وسیع و عریض گلشن ہے۔ جس میں رنگ رنگ کے پھول اپنی بہار دکھاتے ہوئے اپنی خوشبو سے ماحول کو نہ صرف معطر رکھتے ہیں بلکہ زندگی کی شاخوں پہ لہرا لہرا کے دلکش اور دلفریب مناظر کا باعث بنتے ہیں۔ جب خزاں کے جھونکے سر اٹھاتے ہیں تو کچھ جھڑ جاتے ہیں، کچھ ان کی جگہ لینے کے لیے جڑیں پکڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہی حال کم و بیش زندگی کے تمام شعبوں کا ہے ادب چونکہ ایک محترک، حساس اور دلوں کی اتھل پتھل کرنے والا شعبہ ہے جب کوئی بڑا کردار اپنے اختتام سے بغلگیر ہوتا ہے تو اس کے اثرات تا دیر نظر آتے ہیں۔ دنیائے ادب کے تابندہ ستارے انتظار حسین ہے جو اس ازلی و ابدی عمل سے گزرنے کے بعد بھی اس دنیائے فانی سے لافانی دنیا کی طرح کوچ کر گئے۔ انتظار حسین جسمانی طور پر آج کے ماحول میں تھے لیکن ذہنی و روحانی لحاظ سے ماضی اور بھی خاص کر ہجرت کے ماحول کے باشندے تھے۔

انتظار حسین ایک صاحبِ اسلوب ادیب اور کثیر الجہات ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے ۷ دسمبر ۱۹۲۳ء کو بھارت کے آبائی گاؤں ڈبائی ضلع بلند شہر (یوپی) میں آنکھ کھولی۔ ان کے والدِ گرامی منظر علی ایک علمی اور مذہبی شخصیت کے طور پر ''ڈبائی'' کی ایک معروف شخصیت کے طور پر جانے جاتے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو عالمِ دین بنانا چاہتے تھے مگر انتظار حسین کا دھیان اُردو ادب کی کتابوں کی طرف مائل ہوا۔ ۱۹۴۷ء کو تقسیمِ ہندوستان کے وقت وہ اپنے

صدام ساگر

خاندان کے ہمراہ پاکستان کے شہر لاہور میں سکونت پذیر ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے ایم اے اُردو کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ جہاں وہ پروفیسر کرار حسین کے شاگرد تھے۔

انتظار حسین نے زندگی بھر کوئی سرکاری نوکری نہیں کی بلکہ اپنی عملی صحافت کا آغاز روزنامہ ''آفاق'' سے کیا۔ پھر انہوں نے فیض احمد فیض کی دارت میں ہفت روزہ ''امروز'' میں کچھ عرصہ کام کیا۔ ۱۹۷۰ء میں انہیں عنایت اللہ کے روزنامہ ''مشرق'' میں لے آئے جہاں یہ ''لاہور نامہ'' لکھنے لگے۔ ان کے یہ کالم ادب سے متعلق موضوعات پر ہوتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف اُردو میں کالم لکھے بلکہ انگریزی زبان میں بھی لکھے ان کے یہ کالم ڈیلی ''ڈان'' کے ادبی ایڈیشن Authors and book میں چھپا کرتے۔ انہوں نے زندگی کی آخری سانس تک اپنی کالم نگاری کے جوہر روزنامہ ''ایکسپریس'' میں ''بندگی نامہ'' کے نام سے لکھے۔ ان کا آخری اردو کالم ''عربی زبان کے شناور خورشید رضوی'' ۲۵ جنوری ۲۰۱۶ء کو چھپا اسی ایڈیٹوریل پیج پر انکے ہمراہ اوریا مقبول جان اور زمرد نقوی کے کالم شائع ہوئے۔ ان کے کالموں میں بیشتر علمی و ادبی کتابوں، ادبی رجحانات، ادبی سرگرمیوں، اردو مصنفین، اردو کتب و رسائل اور تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی مسائل کے بارے میں لکھتے تھے۔ ایک تحریر میں انتظار صاحب خود لکھتے ہیں کہ ''کبھی کبھی مجھے گمان گزرتا ہے کہ میں ایک فقرے کی پیداوار ہوں''

انتظار صاحب نے جہاں کالم نگاری میں جوہر دکھائے وہی انہوں نے بہ یک وقت ناول، افسانے، مضامین، تنقیدی مضامین، تراجم اور ادبی کالموں کو نہ صرف اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا بلکہ ہر صنف میں اتنے گہرے نقوش چھوڑے جو آج بھی موجودہ ادب کا تاریخی ورثہ ہے۔ انہوں نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز قیام پاکستان سے قبل ہی کر دیا تھا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''گلی کوچے'' ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ ۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ماہنامہ ادب لطیف میں شائع ہوا۔ اس حوالے سے مجھ خاکسار کو محترم ناصر زیدی نے بتایا کہ تب ادب لطیف کے مدیر مرزا ادیب تھے اس افسانے کا عنوان ''قیوما کی دکان'' تھا۔ جسے اُس وقت ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔''

انتظار صاحب کے ابتدائی افسانے ترقی پسند روایت اور حقیقت نگاری کی روایت کے امین تھے۔ انکے ہاں علامتی افسانوں کا رنگ بھی ملتا ہیں۔ کیونکہ ان کے لکھنے کا اسلوب دیگر لکھاریوں سے جداگانہ تھا یہی

وجہ ہے کہ ان کے ہاں اسلوب داستاں بھی ملتا ہے اس حوالے سے ان کے افسانوں کے کئی مجموعے ہیں جن میں ''کنکری''، ''آخری آدمی''، ''شہرِ افسوس'' اور ''کوندے'' وغیرہ۔

افسانوں کے علاوہ انہوں نے متعدد ناول بھی لکھے جن میں چاند گہن، بستی، تذکرہ (جسے بعد میں ''اپنا گھر'' کے نام سے بھی شائع کیا گیا) اور ''رات آگے سمندر ہے'' سے زیادہ شہرت ملی۔ ان کا ناول ''بستی'' انگریزی میں ترجمہ ہوا تو انہیں اس پر بکر پرائز سے نوازا گیا یہ اُردو کا پہلا ناول تھا جس کے حصے میں یہ اعزاز آیا یوں اُردو کا نام عالمی سطح پر جانا گیا۔ ان کے دیگر ناولوں میں آخری آدمی، شکستہ ستون پر دھوپ، شہرزاد کے نام، اپنی دانست میں اور خوابوں کا مسافر وغیرہ۔ ان کے ناول میں بھی افسانوں کی طرح ایک عجب سی کشمکش جگمگاتی تھی۔ ہمیں عہدِ ماضی کے ہجر کا دُکھ چھپا ہوا ان کی تحریروں میں جا بجا پڑھنے کو ملتا ان کے افسانوں اور ناولوں میں کہیں نہ کہیں حقیقت پوشیدہ ہونے کا راز موجود تھا۔ اور یہی ان کی داستانوں میں جو سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں ان میں ایک حقیقت اور سچائی کا روپ نمایاں تھا۔ اس حوالے سے مستنصر حسین تاڑر لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک قرۃ العین اور انتظار حسین شائد دنیا بھر کے ادیبوں میں اس لحاظ سے حیرت ناک طور پر منفرد ہیں کہ ان دونوں کی تحریروں میں جنسی قربت یا صنف مخالف کی کشش کا کہیں کچھ اعتراف نہیں ملتا۔''

انتظار صاحب نے جہاں اخباری کالموں، متراجم، تذکروں، تنقید، سفر ناموں اور صحافتی کالموں میں طبع آزمائی کی وہیں انہوں نے بچوں کے لئے لازوال کہانیوں کے مجموعے تخلیق کیے۔ میرے خیال میں انہوں نے زندگی بھر قلم اور قرطاس سے وابستہ ہوتے ہوئے زندگی کی آخری سانس تک جتنا لکھا اُتنا ہم جیسے بیشتر لوگ ساری زندگی پڑھنے اور لکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

۲۰۱۰ء میں جب عطاالحق نے انکے اعزاز میں تقریب رکھی تو اس دوران حمید اختر نے انتظار صاحب کو اس زمانے کا سب سے بڑا ترقی پسند لکھاری قرار دیا۔ ان کے ادبی خدمات کے اعتراف میں فرانس کی حکومت نے انہیں ستمبر ۲۰۱۴ء میں ''آفیسر آف دی آرڈر آف آرٹس اینڈ لیٹرز'' نامی ایوارڈ سے نوازا۔ جبکہ حکومت پاکستان نے انہیں صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی اور ستارۂ امتیاز جیسے اہم سول اعزازات سے نوازا وہیں انہیں اکادمی ادبیات کی جانب سے ملک کا سب سے بڑا اعزاز کمال فن بھی

تفویض کیا۔

انتظار صاحب سے بڑا لکھاری اور محبتوں، صداقتوں کے امین ۲ فروری ۲۰۱۶ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ مگر ان کی تیسری برسی کے موقع پر ادبی فضا آج بھی افسردہ ہیں۔ ان کی وفات پر جب اکادمی ادبیات نے تعزیتی ریفرنس کی تقریب منعقد کی تو اس دوران عرفان صدیقی نے ایک خوبصورت جملہ کہا تھا کہ ''ایک اور انتظار حسین کے لیے ہمیں صدیوں انتظار کرنا ہوگا۔'' انتظار صاحب کا اکادمی ادبیات کے ساتھ بھی ایک دیرینہ تعلق تھا یہی وجہ ہے کہ اکادمی ادبیات نے انکی فن و شخصیت پر انتظار حسین نمبر شائع کیا جس میں تمام تر تحریریں ان کی فن و شخصیت کی مختلف جہات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس شمارہ میں جہاں ممتاز ادیبوں، نقادوں اور محققوں کے خصوصی مضامین اور مالات شامل کیے گئے ہیں وہیں ممتاز شعراء کا منظور خراجِ عقیدت بھی اس شمارہ کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ دیگر شخصیات سے ان کے انٹرویوز اور دیگر لکھاریوں کی تحریروں سے انتخاب کو شائع کیا گیا ہے۔ اس رسالے کے نگران اعلیٰ ڈاکٹر قاسم بگھیو اور مدیر اختر رضا سلیمی کا تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے ''انتظار حسین نمبر'' انتہائی محنت، لگن اور عرق ریزی سے ترتیب دیا۔ آخر میں اس شمارے سے انتظار حسین کی عقیدت میں جان کاشمیری کی نظم پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

اُردو زبان کا ہے نمائندہ انتظار
مُردوں کی بارگہہ میں رہا زندہ انتظار

☆

کالم نگار بھی تھا فسانہ نگار بھی
تہذیبِ حرف و صوت کا خدمت گزار بھی
پائندہ انتظار تھا، پائندہ انتظار
مُردوں کی بارگہہ میں رہا زندہ انتظار

☆

ہجرت کے زخم زخم کو بھولا نہ عمر بھر
وہ حال کی اداؤں میں ماضی کا ہم سفر
تیرہ شبوں کے شہر میں تابندہ انتظار
مُردوں کی بارگہہ میں رہا زندہ انتظار

☆

پنہاں تھا خامشی میں تکلم جہان کا
علم و ادب کی آن، محافظ زبان کا
پوشاکِ لفظ کے لیے بافندہ انتظار
مُردوں کی بارگہہ میں رہا زندہ انتظار

☆

کردار ناولوں کے، روانی کی جان ہیں
سارے مکالمات، کہانی کی جان ہیں
کیا حال و ماضی، زینتِ آئندہ انتظار
مُردوں کی بارگہہ میں رہا زندہ انتظار

☆☆☆☆☆

زندگی روشن بھی تاریک بھی

زندگی بھی بہت عجیب شے ہے۔ انسان اس کے پیچھے بھاگتا چلا جاتا ہے اور وہ آگے ہی آگے سرکتی جاتی ہے۔ انسان اس کو تھام لینا چاہتا ہے پر نہیں جانتا کہ زندگی کا قیام اس کا اختتام ہے۔ شہر کے تمام گلی کوچوں میں زندگی اپنی موج مستی اور بے فکری سے انسانوں کو روند کر آگے بڑھتی رہتی ہے۔

آنگن غریب کا ہو یا محل کسی دولت مند کا، بھاگ دوڑ دونوں کا مقدر ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی روٹی کے ایک نوالے کے لئے بھاگ رہا ہوتا ہے اور کوئی ایسا ہوتا ہے جس کا پیٹ کسی چیز سے بھرتا ہی نہیں۔ مگر دونوں کا سفر جاری رہتا ہے۔

شہر کی یہ تقسیم صدیوں پر محیط ہے۔ ایک طرف خوشیاں، قہقہے، رنگ و نور کی محفلیں، روشنیاں آسودگیاں جابجا پھیلی ہوتی ہیں۔ ہر طرف امن، سکون، شانتی، خوشحالی کا دور دورہ رہتا ہے۔ یہاں پر تتلیاں، پھولوں کو چوم کر حسن و خوبصورتی کا درس دیتی ہیں۔ باغوں کی گھاس سے محسوس ہونے والی نرمی پیروں کے ساتھ دماغوں کو بھی سکون مہیا کرتی ہے۔ یہاں کی خوشبوؤں سے انسان ایسے مسحور ہو جاتے ہیں کہ وہ سدا اس ماحول میں کھو جانا چاہتے ہیں۔ شہر کے اس حصے میں زندگی اپنے جوبن پر ہے۔ یہاں ہر صبح پرندے اس طرح چہکتے ہیں کہ ان کے چہکنے سے انسان کئی نئی دھنیں تراش لیتا ہے۔ یہاں سورج جب اُگتا ہے تو یوں لگتا ہے۔ جیسے کائنات کا سارا حسن یہاں سمٹ آیا ہو۔ تارکول کی کھلی کشادہ سڑکوں کے پیچھے کھڑے درخت اور ان سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں ماحول کو سحر انگیز کر دیتی ہے۔ درختوں کے پیچھے اور اطراف میں جابجا پھیلے پھولوں کے پودے رنگوں کی برسات کے ساتھ تازگی و شگفتگی کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ یہاں کا ہر موسم، ہر پہر بڑا مکمل اور جاندار ہے۔ صبح کی رونق جب ڈھلنے لگتی ہے اور سورج آسمان پر سر اٹھا کر کھڑا ہوتا ہے تب یہاں کے گھر ٹھنڈک کا وہ سیلاب بن جاتے ہیں کہ سورج کی تپش کو اس سے دور ہٹ جانا پڑتا ہے۔ لمبی لمبی گاڑیوں کے اندر چلتی ٹھنڈی مشینیں انسان کو وہ سکون و شانتی مہیا کرتی ہیں کہ اس کا ہر سفر یادگار بن جاتا ہے۔

شام کے وقت رات ہونے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ یہاں کی شامیں سحر انگیز نشے میں لپٹی ہوتی ہیں۔ لیکن رات کی رونقیں تو شاموں کو مات کر دیتی ہے۔

ہر رات یہاں جشن ہوتا ہے جام و سرور کی

مرزا صہیب اکرام

محفلیں برپا ہوتیں ہیں۔ ہزار قسم کے کھانوں کی مہک بھوک کو بڑھاوا دیتی ہے۔ اتنی اقسام اور انواع کے رزق بکھرے پڑے ہوتے ہیں کہ اکثر اوقات بہت سوں کا جی ان کو دیکھ کر ہی بھر جاتا ہے۔

یوں ہر دن شروعات سے اختتام تک اتنا بھرپور ہوتا ہے کہ اس کے آنے جانے کا کسی کو خاص فرق نہیں ہوتا۔ اس خطہ کو دیکھ انسان کی کامیابی و عظمت اور ترقی کے افسانے، قصے کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہاں کبھی کسی غم، دکھ یا پریشانی کا گزر نہیں ہوتا اور یہ شہر جنت نظیر ہے۔

لیکن کیمرے کی آنکھ جب اوپر اٹھتی ہے اور وہ اپنا رخ اور مقام بدلنے لگتی ہے تو اچانک بہشت کی بستی سے دور ہوتے ہوتے ایک ایسی جگہ انسان جا پہنچتا ہے جہاں ٹوٹے پھوٹے مکان، کچی بستیاں، اجڑے در و دیوار، گندی گلیاں، بدبودار محلے، پھٹے پرانے بوسیدہ خیمے، گلیوں میں کھیلتے بچے اور ماؤں کے سینوں سے لگ کر بلکتے شیر خوار کسی اور ہی دنیا کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک دنیا سے دوسری دنیا کا سفر طے ہو چکا ہے ورنہ ایسا کیونکر ممکن ہے کہ ایک ہی دنیا میں بسنے والے انسانوں میں اتنا فرق ہو۔

یہاں کی کہانی بھوک، افلاس غربت سے شروع ہوتی ہے اور اس کا انت انہی تنگ گلیوں کے کسی ٹوٹے ہوئے باس زدہ گھر پر ہو جاتا ہے۔ یہاں سے خوشیوں کا کبھی گذر نہیں ہوتا۔

یہاں کہانیاں افلاس کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں اور اس کا انجام بھی ان ہی میں بلک بلک کر ہو جاتا ہے۔

ان گلیوں میں بھاگتے دوڑتے ننگ دھڑنگ وجود نہ اپنے ماضی سے آشنا ہوتے ہیں نہ وہ کسی آنے والے کل کے لئے کچھ خواب بچا کر رکھتے ہیں یہاں پر خواب دیکھنے اور خواب دکھانے والا پاگل سمجھا جاتا ہے۔

یہاں بھوک سے جنگ مادر رحم میں ہی شروع ہو جاتی ہے اور موت کے مہیب سایوں کے چھانے تک جاری رہتی ہے۔ بھوکی کوکھ سے جنم لینے والا وجود ساری زندگی بھوک سے نبرد آزما رہتا ہے۔

یہاں ہر صبح بس ویرانی، خوف دکھ، پریشانیاں اور وسوسے لے کر نمودار ہوتی ہے۔ ہر بیدار ذہن کو انجانا خوف گھیرے رکھتا ہے۔ یہاں کوئی پھول کلی خوشبو نہیں بانٹتی۔ یہاں پر دن کے تمام اوقات ایک جیسے ہیں۔ بس سورج کی گردش بدلتی رہتی ہے۔ چہروں سے پژمردگی اور بھوک نہیں جاتی۔

یہاں دن روٹی کی خاطر بھاگ کر گذر جاتا ہے اور راتیں روٹی کے لئے جاگتی آنکھوں سے خواب بنتے بیت جاتی ہیں۔

یہاں پر سردی اور گرمی کا اثر ایک سا ہوتا ہے بس ان سے لڑ کر اپنے بقا کی جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ یہاں بیماری، مصیبت اور وبا سب سے

پہلے آ دھمکتی ہیں۔ اور زرد چہروں سے ان کی آخری چمک بھی چھین لیتی ہیں۔۔ اس بستی کے مکینوں کی چھت نیلگوں اور تاحدِ نظر پھیلا آسمان ہے اور ان کا بستر خدا کی دی ہوئی زمین ہے۔۔ یہ اس میں خوش ہوتے ہیں کہ بس دو وقت کی روٹی میسر آ جائے۔ ان کی ہوس لالچ کبھی باغ و بہار، ٹھنڈی مشین، بیش قیمتی لباس اور کھانوں تک نہیں جا پاتی۔ یہ نہیں جانتے کہ ریشم و کمخواب کس چڑیا کا نام ہے۔ یہ تو بس چہروں سے بھوک کے داغ مٹانے کی فکر میں رہتے ہیں یہ کسی خواب، انقلاب اور احتساب کو نہیں جانتے ان کی فکر بس فکرِ معاش ہے۔ ان کا نظریہ پاپی پیٹ کو بھرنے کا نظریہ ہے۔ تارکول کی سڑکیں، اطراف کے سرسبز درخت، پھول کلیاں، جنت نظیر مناظر ان کی آنکھ تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔

یہ ایک دنیا کے دو باسی ہیں۔ ایک جانب مناظرِ جنت اس قدر ہیں کہ کسی دوسری جنت کا خیال بس خواب لگتا ہے لیکن وہیں زندگی اس درجہ جہنم بنی رہتی ہے کہ کسی اور جہنم کا قصہ بس وہم محسوس ہوتا ہے۔ دیکھنے والی آنکھیں سوچتی ہیں شاید یہی کل ہے۔ جو دونوں مکین جی رہے ہیں۔ یہی آغاز ہے اور یہی خاتمہ۔

اٹھو میرے ہیرو اسکول جانے کا وقت ہو گیا۔ یاد ہے نہ آج اسکول میں فن ڈے ہے۔۔

”یس مام یاد ہے۔ میری چیزیں آ گئی ہیں“

جی بیٹا پاپا کل سارا سامان لے آئے تھے۔

زندگی کا ایک رخ یہ بھی ہے

”ماں سب بچے اسکول جاتے ہیں۔ مجھے بھی جانا ہے“

نہ میرا پتر ایسی باتیں نہیں کرتے وہاں صاحب لوگ کے بچے جاتے ہیں۔ تو اگر اسکول جائے گا تو کام پر کون جائے گا

مما مجھے نہیں چاہیے۔ یہ سائیکل ایک دم بیکار ہے۔ بس اب آ گئی ہے تو یہی رکھ لو۔ ماں نے لاڈ سے کہا۔

کیا بات ہے کیوں میرے بیٹے کو تنگ کیا جا رہا ہے۔ دیکھیں نہ پاپا مجھے یہ سائیکل نہیں پسند۔ مجھے گیئر باکس والی چاہیے۔

ہاں تو میرے شیر اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ وہ بھی آ جاتی ہے بس تم آنسو صاف کرو۔

نہ بیٹا نہ یہ چھوٹے صاحب کا سائیکل ہے۔ اس کو چھونا مت۔

پر ماں وہ اب اس کو نہیں چلاتے۔ تم مجھے مانگ کے لے دو نہ۔

بیٹا کیوں ایسی ضد کر رہے ہو۔ چلو بس ایک بار اس پر بیٹھ کر دیکھ لو جلدی سے۔۔

بس ہم شادی کے بعد سوئٹزرلینڈ چل رہے ہیں۔ اب تو خوش ہو تم؟

کیا خاک خوشی ہے صرف 15 دن کا ٹور ہے شادی کیا روز روز ہوتی ہے۔ میرا موڈ آف کر دیا ہے۔

شادی کی خوشیاں یہاں رشتوں کے جڑنے سے کہیں زیادہ برانڈز کر روپیں کا اشتراک ہوتی ہیں۔

یہ کیا ہے اکبر۔ یہ شادی کا تحفہ۔ ہائے اتنا مہنگا لگ رہا ہے۔ ہاں تو اور کیا پورے پانچ سو کی

بالیاں ہیں۔
ہائے اللہ میں ان کو سنبھال کر رکھوں گی۔
چل پہن کر تو دکھا دے۔ نہ بابا نہ اتنی مہنگی چیز کیا خراب کر دوں۔
یہاں شادی کا کل سرمایہ بس چند مسکراہٹیں ہوتی ہیں۔ اور یہاں ہنی مون کا مقصد شادی کے بعد بازار سے چاٹ کھانا ہوتا ہے۔ پر یہ رشتے بھی جڑ رہے ہیں۔ یہاں کے رواج ناطے رشتے اسی انداز میں پروان چڑھتے ہیں۔
مما مجھے پزا کھانا ہے۔ نہیں بیٹا ناشتہ میں تو پزا، یہ آواز اسی شہر کے کسی مکان سے آتی ہے۔ وہیں پر "ماں مجھے بھوک لگی ہے"۔ بس بیٹا آج تیرا باپو صرف کچھ کما کر لائے گا۔ پھر میرا بیٹا پیٹ بھر کر کھانا کھائے گا۔ میرے لال رومت۔
یہ آوازیں، ہمیشہ سے گونج رہی ہیں مگر ان کا مداوا کبھی نہیں ہوا۔ یہ اب بھی جاری ہیں۔
شہرِ بے مثال کے حسن کو ماند کرتی یہ بستیاں یہ افلاس سے بھرے چہرے، یہ ننگے وجود اسی طرح وقت کے سفر کا حصہ ہیں۔
ماہ و سال کی تبدیلیوں سے ایک جانب کے جلوے اور بڑھ گئے ہیں جب کہ دوسری طرف کی بدصورتی میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔
یہ بڑی عجیب تقسیم ہے۔ ان دونوں جہتوں کا ساتھ ازل سے جاری ہے۔ معاشرے کے یہ بانجھ خواب جتنے بھی بدصورت، کریہہ اور بدنما لگنے لگیں۔ شہر کا حسن آنکھوں کو بھلا بھی ان کی وجہ سے لگتا ہے۔ بدصورتی حسن کو زندہ رکھتی ہے۔ حسن و فریب بدصورتی کو قائم رکھتا ہے۔
نفرت و نخوت اور بے بسی و لاچاری کا یہ سلسلہ بس جاری ہے۔
دونوں اپنے اپنے دائروں میں محوِ سفر ہیں۔ دونوں کو اپنے محور کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ اگر کوئی اِدھر سے اُدھر ہو جائے تو شہر کے امن کو خوف کھانے لگتا ہے۔
روشنیاں صرف اندھیرے مٹاتی نہیں ہیں بلکہ بعض اندھیرے تو روشنی کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ کچھ قہقہے آنسوؤں سے بھی گونجا کرتے ہیں۔ بعض خوبصورتیاں، بدصورتیوں کی وجہ سے زندہ رہتی ہیں کچھ رنگ اپنے وجود کی خاطر کورے کاغذ بچا کر رکھتے ہیں۔ ٹھنڈی ہواؤں کا گرم تھپیڑوں کے بنا کیسا وجود۔۔
گرم بستر اپنی نرمی تب محسوس کراتا ہے جب زمین ٹھنڈ سے سسک رہی ہو۔
کھانے کی لذت سے بھوک کی قیمت کا تعین کیا جاتا ہے۔ سفیدی کا غرور سیاہ کو زندہ رکھنے میں ہے۔ موت زندگی کی بانہوں میں جھولتی ہے۔
یہ سفر جاری ہے۔ کب تک جاری ہے کوئی نہیں جانتا۔ کیا معلوم کبھی اس شہرِ بے مثال سے کبھی ایسی محبت کی لہر اٹھے جو زرد چہروں سے بھوک، آنسو، دکھ کرب اپنے اندر سمو کر ان کے لئے کچھ زندہ خواب مہیا کر دے۔ روشنیوں کا کچھ اثر اس بستی کے خیموں تک بھی جا پہنچے اور وہاں پر بھی سورج خوشیاں لے کر آنے لگے۔ بھوکے شکم بھر جائیں کیا معلوم کبھی ایسا ہو۔

☆☆☆☆☆

حاضراللہ سائیں

ریاض ندیم نیازی

سیر و سیاحت کا عمل صدیوں سے جاری و ساری ہے۔ جو لوگ کسی دوسرے ملک، جگہ، شہر یا وادیِ پُرفضا کی سیر کرنے جاتے تھے وہ آ کر اپنے عزیز و اقارب، دوست احباب اور رشتے داروں کو اُس ملک، جگہ، شہر یا وادیِ پُرفضا کی عجیب و غریب، انوکھی اور ناقابلِ فراموش باتیں اور واقعات بتاتے تھے اور لوگ اُن کی باتوں اور واقعات کو سن کر حیرت زدہ رہ جاتے تھے اور کچھ لوگ تو اِن باتوں اور واقعات کو ناقابلِ یقین جانتے تھے۔ اِس طرح زبانی کلام چلتا تھا، مگر یہ یادیں ذرا سی پرانی ہو جانے پر اپنا اثر کھو دیتی تھیں اور ذہن سے محو ہونا شروع ہو جاتی تھیں۔ اِن باتوں اور واقعات کو یاد رکھنے اور ہمیشہ تر و تازگی کے ساتھ محسوس کرنے کے لیے اُن لوگوں نے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے یا یوں کہیے کہ جو اہلِ قلم تھے اور شعر و ادب سے جن کا تعلق تھا، اُنھوں نے مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کرنے کے بعد ناقابلِ فراموش واقعات کو لکھنا شروع کر دیا جو بعد میں سفر نامہ کہلایا اور یوں رفتہ رفتہ ہزاروں سفرنامے منظرِ عام پر آنے لگے۔

اِن سفرناموں میں حج وعمرہ کے سفرنامے بھی شامل تھے جو عام سفرناموں سے ہٹ کر لکھے جاتے تھے کیوں کہ اِن حج وعمرہ کے سفرناموں میں حضورِ اکرم، نورِ مجسم (صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) سے والہانہ عقیدت کا اظہار اور خانۂ کعبہ کے تقدس اور پاکیزگی کے شدید جذبات بھی شامل ہوتے تھے اور اِن سب کی جان روحانیت ہوتی تھی۔ مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کی زیارت، مسجدِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) کا دیدار اور روضۂ اطہر کی حاضری کا شوق عالمِ اسلام کے تمام مومنین اور مومنات اور مسلمین اور مسلمات کو ہوتا ہے، لہٰذا حاضری کی تڑپ رکھنے والوں کے لیے یہ سفرنامے جہاں والہانہ عقیدت سے ہوتے تھے وہاں اِن میں بھرپور روحانیت بھی بھرپور پائی جاتی تھی اور یہ معلومات کا خزانہ بھی ہوتے تھے۔ لوگ جب تک حج یا عمرے کے لیے نہیں جا سکتے تھے وہ یہ سفرنامے پڑھ کر اپنا ایمان تازہ کرتے تھے اور اِن مقدس مقامات کی روداد جانتے اور اِن کی جزئیات نگاری میں کھو کر رہ جاتے تھے۔ آج بھی جو لوگ مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کی ہزاروں کوششوں اور لاکھوں جتن کے باوجود زیارت نہیں کر سکے وہ اب بھی حج وعمرے کے سفرناموں کو بار بار پڑھ کر اپنی آنکھوں کو نم ناک اور دل کو شاد کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن تو ہم بھی اِن مقدس مقامات اور اِن معطر ماحول میں زندگی کے چند روز گزاریں گے اور پاکیزہ آب وہوا میں سانس لیں گے۔

فی زمانہ مستنصر حُسین تارڑ، حکیم محمد سعید (شہید) اور قمر علی عباسی صاحبان کے سفرنامے سب سے زیادہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اِن میں اور دیگر حج وعمرہ پر جانے والوں کے سفرنامے جو حج وعمرہ کی روداد پر مشتمل ہیں بہت زیادہ ہیں اور اِن حج وعمرہ کے سفرناموں میں جناب ممتاز مفتی کے سفرنامے ''لبیک'' نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔

اب حال ہی میں جناب ارشد ملک کا سفرنامۂ حج ''حاضر اللہ سائیں'' کے نام سے نہایت دیدہ زیب شائع ہوا ہے، جس میں والہانہ عقیدت بھی شامل ہے اور روحانیت بھی، اُنھوں نے نہ صرف ایک سچے عاشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) اور پکے مسلمان عبد کی عبدیت کی حیثیت سے مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے بلکہ جو

اُن پر کیف و سرور کے لمحات گزرے ہیں اُن کا بیان بھی نہایت جو شیلے انداز میں کیا ہے۔ اُن کا سفرنامۂ حج ''حاضر اللہ سائیں'' اِس لیے بھی انفرادیت کا حامل ہے کہ اِس میں اراکینِ حج اور روضۂ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم) پر حاضری کے لمحات کی جزئیات تک بیان کر دی گئی ہے۔ جہاں ارشد ملک صاحب نے اپنے تجربات کا ذکر کیا ہے وہاں عمیق مشاہدات کو بھی ایسے لکھا ہے کہ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کے حسین مناظر کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھ رہا ہے اور وہ بہ نفسِ نفیس خود وہاں موجود ہے اور وہاں کی نورانی آب و ہوا کو اپنے جسم و جان میں اُترتا ہوا محسوس کر رہا ہے۔ ارشد ملک صاحب نے ایسے نازک موقعے پر اپنے نازک احساسات کو بھی قلم بند کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہیں۔

زبان و بیان کی خوبیاں فکر و احساس کی ندرتوں پر مستزاد ہیں۔ زبان کی صفائی اور اسلوب کی پختگی و پُر تاثیری وہ اوصاف ہیں جن کے سبب اِس سفرنامے کو عہدِ حاضر کے ادب عالیہ میں جگہ مل سکتی ہے۔ ایسی رواں دواں اور دل کش نثر لکھنا آج کے دور میں آسان نہیں۔ زبان سے بے اعتنائی کے زمانے میں ایسے شہہ کار کا سامنے آنا نیک فال ہے۔ لفظ و خیال کی ہم آہنگی نے اِس کتاب کو اہلِ دل کے لیے ارمغانِ خاص بنا دیا ہے۔

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ارشد ملک صاحب کا سفرنامۂ حج و عمرہ ''حاضر اللہ سائیں'' اُن سیکڑوں حج و عمرہ کے سفرناموں سے زیادہ پُر تاثیر ہے جو اُن لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں جن کو لکھنا نہیں آتا، یعنی وہ لوگ قلم کار نہیں ہوتے نہ اُن کا اہلِ ادب میں شمار ہوتا ہے اور نہ وہ شاعر و ادیب ہوتے ہیں۔ جذبات کی نورانیت، والہانہ عقیدت اور پاکیزہ روحانیت لیے ہوئے ہے اور اِن دونوں مقدس مقامات کی معلومات کا خزانہ بن گیا ہے۔ سفرنامے کے مطالعے کے دوران جو سب سے بڑی خوبی سامنے آئی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ سفرنامہ نگار کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور رحمت کی بارش میں خود بھی بھیگ رہا ہے۔ ایسا پُر تاثیر اور اہم سفرنامہ ایک طویل عرصے کے بعد سامنے آیا ہے۔

میں سفرنامہ نگار جناب ارشد ملک کو اِس کارِ خیر پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

افتخار شفیع کا نیلا چاند اور دلِ حیرت

میری نصف صدی سے زیادہ عمر لاہور سے ملتان یا پھر ملتان سے لاہور کے سفر میں کٹی ہے۔ لاہور (جو کبھی میرا شہر تھا اور اب نہیں ہے) سے مجھے یوں آنا پڑتا تھا کہ اس کی خاک میں میرے کچھ پرکھوں کی ہڈیاں اور کچھ کی راکھ ہے، جنھیں میں بھلانا تو چاہتا ہوں لیکن بھول نہیں سکتا کہ یہ خاک ملی راکھ میرے چہرے پر ایک منجمد پچھتاوے کی مانند یوں چپکی ہے کہ کسی تیز ترین آلے سے بھی کھرچی نہیں جا سکتی۔ ملتان میں میرا جسم پوری تن دہی سے ایمرسن کالج میں (جو اپنی عمارت اور تاریخ سے تہی ہے) اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے۔ مگر میرا دل گورنمنٹ کالج لاہور کے اوول گراؤنڈ، پرشکوہ گوتھک سٹائل کی عمارت کے وسیع برآمدوں اور لاجیا میں بھٹکتا رہتا ہے یا جو سرما کی تند و طویل پورے چاند کی راتوں میں دریائے راوی کے اندر کامران کی بارہ دری کے آس پاس ایک بڑی کشتی میں اپنے دوستوں کے ساتھ مستعد اور فعال ایجنسیوں سے بے پروا غل غپاڑہ میں مصروف ہوتا ہے۔ (میرے دوست جواب نہیں ہیں) مگر مجھے ان کی خاطر ملتان سے لاہور کا سفر کرنا ہوتا ہے۔ سفر میرا جبر ہے اور پھر میں عمر کے اس حصے میں ہوں جب ''آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے'' اور آج کسی گول مٹول سیانی گڑیا کے پاس میری مشقت کا سبب پوچھنے کا وقت بھی تو نہیں۔ مجھے سفر کے عین وسط میں پڑاؤ کرنا ہوتا ہے۔ میرے عزیز جوان اور بلند حوصلہ باغی دوست ممتاز اطہر کا صائب مشورہ ہے کہ:

کوئی مقام پڑاؤ کے حق میں ٹھیک نہیں
یہ سوچ کر ہی چلا جائے گر چلا جائے

.....

اور میرے پڑاؤ کا یہ مقاماتی منٹگمری شہر اور اس کے ریلوے سٹیشن کا طویل پلیٹ فارم ہیں، اور جس کے بارے میں افتخار شفیع کا تجربہ کچھ یوں ہے:

خالد سعید

مجھ کو یہ علم تھا کہ وہ منظر نہیں رہے
میں پھر بھی ساہیوال بڑی دیر تک رہا

.....

مگر مجھے تو یہاں بس تھوڑی دیر کے لیے رکنا ہوتا ہے تا کہ بدن کے تھکے ہوئے گھوڑے میں اتنی توانائی آ سکے کہ اپنی منزل کی جانب رواں ہوں۔ اور اسی شہر کے ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر کسی دوست نے مجھے پہلی دفعہ مجید امجد سے متعارف فرمایا، ان کے چہرے اور جسم کے خطوط میں ایک بے کراں دشتِ تنہائی لرزاں تھا کہ جس سے میری ہڈیاں جھنجھنا اٹھیں۔ ان کے شعر میرے دل میں گونجے:

دل نے ہر ایک دکھ سہا تنہا
انجمن انجمن رہا ، تنہا
تیری آہٹ قدم قدم اور میں
اس معیت میں بھی رہا تنہا

.....

میں ان سے کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر لفظ زبان پر آنے سے گریزاں رہے۔ ٹرین نے وسل دی، اور میں ان سے ہاتھ ملا کر اپنے ڈبے میں سوار ہونے کے لیے چل دیا۔ اسی شہر میں ایک اور پڑاؤ کے دوران میں، میں نے ایک پگلی دیکھی، اس کا اصل نام تھا چن دیوی۔ اسم با مسمّیٰ، یوں لگتا تھا جیسے چاند عمر رسیدہ ہو کر زمین پر اتر آیا ہو۔ چہرے پر وہ حسن اور معصومیت کہ اس ہر لاکھ جوانیاں فدا ہوں۔ معصوم اور بھلے اہل شہر اسے ولیہ جانتے اور اس کی خدمت میں صرف عقیدت کے گلاب ہی نہیں بل کہ اور نذرانے بھی پیش کرتے۔ وہ کبھی تو ان نذرانوں کو قبول کر لیتی اور کبھی سختی سے مسترد کر دیتی۔ یوں تو اس کی خدمت میں کئی تحفے لیے سٹیڈیم ہوٹل کا مالک جوگی بھی آیا کرتا تھا۔ مگر اس کا لایا ہوا وہ کوئی تحفہ کبھی قبول نہ کرتی۔ جوگی جو کبھی اس کا پتی دیوتا تھا اور جس کی چاہ کی خاطر وہ برصغیر کی تقسیم کے وقت اس شہر میں رہ گئی تھی کہ جو تب اس شہر کی محبت میں مسلمان ہو گیا تھا اور پھر اسے نومسلم خاوند سے ایسی نفرت ہوئی کہ پرکھوں کے دھرم کی محبت میں سودائی ہو گئی، اور:

لٹاں کھول گلے وچ پائیاں میں بیا گن اودی دو
(شاہ حسین)

جب میں نے اسے دیکھا تو وہ تب بے حد سکھی تھی یا بے حد دکھی۔ میرا خیال ہے میں یہ کبھی نہ جان پاؤں گا، مجھے اس کی کتھا بھی لکھنی ہے۔ مگر مجھے یقین ہے میں یہ پریم کتھا کبھی نہ لکھ پاؤں گا۔ اور سٹیڈیم ہوٹل کا جوگی، ادب کا رسیا اور مجید امجد کا قریبی دوست۔ اور اسی مانند دشتِ تنہائی میں بھٹکتا ہوا راہی۔ ایک ایسا لاولد، جس کے تین بیٹے اپنے ننھال کے ہم راہ بھارت ہجرت کر گئے۔ اور اب شاید بمبئی (جواب بمبئی

نہیں رہا) یا مدراس (جواب مدراس نہیں رہا) میں پاکستان سے آئے شرنارتھی کہلاتے ہوں گے۔ یا پھر نئے بھارت کے باسی اور شاید خود وہ بھی اپنے ماضی کو بھلا چکے ہوں گے اور ایک خوش باش جیون بسر کر رہے ہوں گے۔

ایسے ہی ایک پڑاؤ میں مجھے مجید امجد اکیڈمی کے اجلاس میں اسی معنک شاعر سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا کہ جو آج یہاں صاحب شام ہے۔ اپنی قیامت خیز جوانی کے باوجود مجھے یہ شخص اپنا بڑا مہربان بھائی لگا۔ (میرا بھائی جو کبھی تھا اور اب نہیں ہے)۔ دردِ خیال کی ایک خستہ حال کھڑکھڑاتی بس کا بیک گیئر لگا۔۔ مگر بھائی تو شریک بھی ہوتے ہیں۔۔ بھائی تو ہابیل اور قابیل بھی تھے۔ دراہ شکوہ اور اورنگ زیب بھی تو بھائی ہی تھے۔ لیکن ایک بھائی شاعر رسول حمزہ توف کا بھی تھا کہ جو ستالن گراڈ (جواب شاید ستالن گراڈ نہیں رہا) کی جنگاہ میں کام آیا تھا، اور جس کے بارے میں اس نے لکھا تھا:

اور اسی غم میں مری آنکھ کا گوشہ تر ہے
اب مری عمر مرے بھائی سے کچھ بڑھ کر ہے

.....

اور میری عمر تو اب میرے بھائی سے بہت بڑھ چکی ہے۔ فیض نے اپنے بھائی سے کچھ یوں شکوہ کیا تھا:

مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ مری عمر گزشتہ کی کتاب

.....

اور مجھے اپنے بھائی سے شکوہ ہے کہ وہ جاتے جاتے میری کتاب آئندہ بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے اس سے شکایت ہے کہ صرف اسی کے کارن اس کی جدائی کا گھاؤ وقت کے ساتھ اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ اور میرے پتھر دل پر اس کی شبیہ سرخ سے سرخ تر ہوتی جاتی ہے۔ کاش وہ اس قدر مہربان نہ ہوتا۔ مجھے کسی دن اس کے عدل اور احسان کی کہانی لکھنی ہے اور یہ کہ میں اس کی برگد چھایا کے بغیر کس قدر مضمحل اور اداس ہوں، مگر ساتھ ہی مجھے یقین ہے کہ مجھے وہ باوقار لفظ کبھی نہ ملیں گے کہ جن سے میں اس سب کو بیان کر سکوں۔

مرا بھائی مرے اوپر ہمیشہ چھاؤں رکھتا ہے
مرے سر پہ قیامت یہ شجر آنے نہیں دیتا

.....

اور میں دنیا کے ان تمام بھائیوں کی سلامتی کی دعا کرتا ہوں جو قابیل اور اورنگ زیب جیسے نہیں ہیں۔

خاکسار نے مختلف ادبی محفلوں میں اس کی غزلیں اور نظمیں سنی ہیں اور دل ہی دل میں اس کی بزرگی کا قائل ہے۔ اس کا پہلا شعری مجموعہ ''نیلے چاند کی رات'' میرے لیے ایک گہرا جمالیاتی اور روحانی تجربہ ہے۔ ''چاند'' اس کی شاعری کی کلید ہے۔ اور یہ وہ

محبوب ہے جوگا ہے گا ہے اسے جھلک تو دکھلاتا ہے مگر اس کی پہنچ سے بہت دور ہے:

شب کا سارا بوجھ اتارا جاسکتا تھا
تاریکی میں چاند پکارا جاسکتا تھا
تاریکی میں چاند سا جیسے اترا ہے
دیکھا تھا اک سپنا سونے جنگل میں
چاند بھی ہے پانیوں کی قید میں
ریت بھی اس ریت گھر میں قید ہے
خود کو استراحت سے چاند نے نکالا تھا
جب سفر پرندوں کا ختم ہونے والا تھا

.....

اور پھر ایک غور طلب اور دل چسپ بات یہ بھی ہے کہ نیلے رنگ کو چاند کی گولائی دے کر اس نے ایک سرئیلسٹ تخیلہ کو تمثال بند کیا ہے۔ نیلا رنگ جو مغربی ثقافت میں حزن و ملال کی کیفیات کو عکس بند کرتا ہے۔ برصغیر کی تہذیب میں یہ وشنو کا رنگ ہے اور بالخصوص اس کے ایک اہم اوتار کرشن کے رادھا کے ساتھ رواجی اور قانونی محبت یا شادی سے باہر کی محبت کا علامت ہے۔ یہ وہ محبت ہے جو سٹیٹس کو کی نفی کرتی ہے اور معاشرت کے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ایک تازگی بخش ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ کرشن، رادھا اور افتخار شفیع کی محبت میں مشابہت کے باوجود ایک باریک فرق ہے۔ کرشن اور رادھا کا سمبندھ ایک مسلسل وصال کی کیفیت کو عکس بند کرتا ہے جب کہ افتخار شفیع کی اکثر نظمیں (جیسے فورٹ منرو میں، یوٹو، گردش، نیا ایکسل سفر بے انت ہے) میں ہجر و فراق کی کیفیات مجسم ہیں۔ دراصل کامیاب محبت اور مسلسل وصال میں ان گنت قباحتیں ہیں۔ آج کی جینیاتی، انجینئرنگ اور طبی معاونتوں کے باوجود کامیاب محبت اخروی محبت کی موت ہے۔ جب کہ ہجر و فراق اور ناکام محبت کا مقصد بہ ہر طور محبت کا حصول ہے۔ ایسا سفر جو کبھی ختم نہیں ہوتا لیکن اس کا آغاز کرنے کے لیے افتخار شفیع نے انتہائی شرافت سے کام لیتے ہوئے ''مجھے اذن سفر دے مہرباں عورت'' کہہ کر اجازت بھی طلب کی ہے۔

مجھے افتخار شفیع کی شرافت سے ڈر لگتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس سے اس کی ذات کو کوئی ضرر پہنچ سکتا ہے بل کہ اس لیے کہ یہ عمل کسی کی شاعری کے لیے سخت مہلک ہو سکتا ہے۔ سفر تو اجازت کے بغیر بھی کیا جاسکتا ہے، ناچیز ناکام محبت کے ساتھ ساتھ بغیر اجازت سفر کا قائل ہے۔ افتخار شفیع بہ یک وقت بے حد جدید اور قدامت پسند فن کار ہے۔ جدید معنوں میں یوں کہ اس کی نظموں، غزلوں میں اس کا اپنا جیتا جاگتا تجربہ لفظ بند ہوتا ہے۔ ہاں جو شے اس کے تجربے میں نہیں آئی اسے اس نے موضوع سخن نہیں بنایا اور قدامت پسند اس مفہوم

میں کہ اس نے اپنی ثقافتی، تاریخی اور ادبی روایات کو نظر انداز نہیں کیا:

ہجرت کی گھڑی ہم نے ترے خط کے علاوہ
بوسیدہ کتابوں کو بھی سامان میں رکھا
اک عمر گزاری نئے آہنگ سے لیکن
اجداد کی اقدار کو بھی دھیان میں رکھا

.....

ان اشعار میں بوسیدہ کتاب اور اجداد کی اقدار دراصل اس کا اجتماعی لاشعور ہیں۔ وہ اپنی روح میں چھپے ہوئے موہن جوڈارو اور ہڑپہ کو مسترد نہیں کرتا اور نہ اپنی مذہبی روایات سے ہراساں ہے بل کہ وہ اپنی تشکیل نو اور نمو کے لیے انھی روایات سے رس حاصل کرتا ہے۔ اس کی شاعری کے مطالعے سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ میر، ناصر کاظمی اور مجید امجد کو اس نے پوری سنجیدگی کے ساتھ پڑھا ہے، اپنی لسانی تشکیلات میں ان سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے، اپنی شاعری میں ترکیب سازی سے کام لینے کے ساتھ ساتھ لفظوں اور تمثالوں میں بھی ایسا ربط پیدا کیا ہے کہ اس کی غزل کا شعر ہو یا نظم، وہ ایک بھرپور علامت میں ڈھل سکیں۔ وہ اپنے ماحول کا عمیق مشاہدہ کرتا ہے اور زندگی کے چھوٹے چھوٹے اور متنوع تجربات سے گہرے معانی اخذ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر:

بارش کی ایک بوند کا گرنا تھا اور پھر
موسم میں اعتدال بڑی دیر تک رہا

.....

بہ ظاہر یہ شعر ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے مگر یہ بارش کی ایک بوند، محض بارش کی بوند ہی نہیں، یہ نئے خیالات کی بارش بھی ہو سکتی ہے، یہ موسم سیاست، معاشرت یا کسی اور شعبے میں بھی ہو سکتا ہے جو زندگی میں توازن اور حسن پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح بوند کا گرنا ایک بھرپور جنسی تجربے کو بھی عکس بند کرتا ہے۔ اگر کسی شعر کی ایک سے زیادہ سطحوں پر تعبیر کی جا سکے تو بلاشبہ یہ ایک عمدہ شعر ہے۔ یا پھر دیکھیے:

جنوری کی سرد شامیں گاؤں کا اک ٹی سٹال
گاڑیوں کے آنے جانے کی صدا میں اور تو

.....

اپنی سادگی کے باوجود یہ شعر ہمارے سامنے ایک دل کش شبیہ لاتا ہے۔ افتخار شفیع کی غزل کا کوئی شعر ہو یا نظم -- سب کہانیاں ہیں۔ یوں تو کسی مصور کی بنائی ایک تصویر بھی کہانی ہوتی ہے اور ایک پھول بھی کہانی ہے، لیکن ہمارے افتخار شفیع کی کہانی بنیادی طور پر نہ جینے والی صورت حال میں جینے کا جتن ہے۔ یہ جتن جرأت، خلوص اور حکمت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ افتخار نے اظہار کی حسین جسارت کی ہے۔ میں اس جسارت پر اسے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اس کا دل ہمیشہ حیرتوں سے بھرا رہے کہ حرف نظر کشائد ہوں اور دعا گو ہوں کہ اس میں وہ کمال پیدا ہو کہ:

"گردوں گرفتہ دارتو چشم گر کشائد"

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر صغیر احمد صغیر کے شعری مجموعے مراد تو ہے پر تبصرہ

فن کسی کی ذاتی جاگیر نہیں ہے۔ یہ تو ایک خداداد صلاحیت کا نام ہے۔ جسے چاہے وہ رب نواز دے۔ فن احساس کی اس گہرائی کا نام ہے جس میں تخلیق کار جو کچھ خود محسوس کرتا ہے اس کا برملا اظہار کرتا ہے۔ پھر چاہے وہ شاعری ہو، مصوری ہو، تحریر ہو یا تنقید۔

بات اگر شاعری کے لحاظ سے کی جائے تو یہ جذبات کے اظہار کا کم سے کم الفاظ میں بہترین ذریعہ ہے۔ جس میں ایک شاعر اپنے کمال کو تب پہنچتا ہے جب سننے والا اس شاعری کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق محسوس کرے اور وہ اس کے دلی جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کرے۔

فی زمانہ جن شعرا کرام کی شاعری کا ہر سو چرچا ہے ان میں ایک قابل ذکر نام ڈاکٹر صغیر احمد صغیر بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب پیشے کے اعتبار سے تو سائنس کے استاد ہیں۔ لیکن خدا جانے شاعری کے میدان میں کس طرح آ نکلے؟ کیونکہ سائنس والے تو بڑے حسابی کتابی ہوتے ہیں۔ جبکہ شاعری میں دو جمع دو پانچ بھی نکالا جا سکتا ہے۔ خیر ڈاکٹر صاحب نے جہاں بہترین استاد ہونے کا حق ادا کیا وہاں اپنی شاعری کے ذریعے یہ بھی ثابت کیا کہ ایک سائنس کا استاد بہترین شاعر بھی ہو سکتا ہے۔

حال ہی میں ڈاکٹر صاحب کا شعری مجموعہ ''مراد تو ہے'' چھپ کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ جس کے لیے ان کو ڈھیروں مبارک۔ جب یہ شعری مجموعہ مراد تو ہے، آپ کے ہاتھوں میں آتا ہے تو اس کا خوبصورت اور دیدہ زیب ٹائٹل آپ کی آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے اور آپ رنگوں کے حسین امتزاج کی داد دیئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس کے دیباچہ نگاروں میں نہایت قابل احترام حسن عسکری کاظمی، جناب کرامت بخاری اور غلام حسین ساجد صاحب شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب نے کہنا یہ تھا کہ -- عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ کتاب کے آخری فلیپ پر

سیدہ آمنہ ریاض

جناب زاہد آفاق (کوئٹہ) جبکہ کتاب کی پچھلی جانب جناب ڈاکٹر جواز جعفری کا خوبصورت تبصرہ موجود ہے۔

اللہ کے بابرکت نام سے شروعات حمد باری تعالیٰ کی صورت میں کی گئی ہے۔

یہ سب جہاں میں جو رنگ و بو ہے، مراد تو ہے
جہاں خسارہ، وہیں نمو ہے مراد تو ہے

.....

اس کے بعد خوبصورت نعت شریف لکھی گئی ہے:

رب نے کہا کہ آج سے نعمت تمام شد
یا ایھا الرسولؐ نبوت تمام شد

.....

نعتؐ شریف کے بعد سلام کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بیان کیسے کریں کیا حسب حسینؑ کا ہے
نبیؐ حسینؑ کے ہیں اور رب حسینؑ کا ہے

.....

عقیدت و احترام کے سلسلے کے بعد تقریباً کم و بیش 140 غزلیات ہیں۔ جو کہ تمام ہی لاجواب ہیں۔ آپ جب صغیر احمد صغیر کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو آپ ہی کے دل کی آواز ہے اور یہی ایک کامیاب شاعر کی نشانی ہے۔ چند خوبصورت اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہم بھی خموش ہی رہے، اس نے بھی کچھ کہا نہیں
کیسا عجیب وصل تھا؟ ہو کے لگا، ہوا نہیں

تمام شہر کو جو سچ ہوا بتاؤں گا
پھر اس کی جتنی بھی قیمت ہوئی چکاؤں گا

.....

کہاں سے درمیاں لے آئے ہو جو سب نہیں ہوتا
محبت کا تو دنیا میں کوئی مذہب نہیں ہوتا

.....

اک تو خوددار ہے پھر دوست بھی میرا ہے میاں
وہ کسی شاہ کا دربان نہیں ہو سکتا

.....

بولنے لگ گئے در و دیوار
جب مسلسل رہا کہیں خاموش

.....

سوال: حسن و محبت میں کیا تعلق ہے
جواب: حسن کا ردعمل محبت ہے

.....

جھرنے، ہوائیں، بارشیں، سیف الملوک جھیل
گر تو نہیں تو وادی ناران مسترد

.....

مذکورہ بالا اشعار میں آپ کو غم دنیا کے ساتھ ساتھ غم جاناں کی بھی جھلک دکھائی دے گی۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے ڈاکٹر صاحب کی شاعری ایبسٹریکٹ آرٹ کا ایک ایسا نمونہ ہے جس کو جس جانب مرضی موڑ دیں، آپ ویسا ہی لطف محسوس کریں گے۔

آپ کو اس شاعری میں ہجر و وصال کے سارے ذائقے ملیں گے۔ ہاں ایک چیز جو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملی وہ سستا اور عامیانہ انداز ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں آپ کو بالکل بھی لچر اور گھٹیا پن نہیں ملے گا۔ نیز غالب و اقبال جیسی مشکل پسندی بھی نظر نہیں آئے گی۔ شاعری میں سلیس و سادہ اسلوب جو عوام الناس کے دلوں میں گھر کر جائے، ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا خاصا ہے۔
محبوب سے شکوہ شکایت، محبت، روٹھنا منانا الغرض سارے لوازمات موجود ہیں لیکن خوداری کا عنصر بہر حال موجود ہے۔ یوں لگتا ہے کہ آپ نہ تو محبوب کو قدموں میں لانا چاہتے ہیں اور نہ ہی خود اس کے قدموں میں گرنا چاہتے ہیں۔
چند دیگر اشعار جن میں مثبت اور منفی روایات، اقدار اور معاشرتی رویے جھلکتے ہیں کہ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا ملاحظہ فرمائیں:

یہ بات میرے بڑوں نے مجھے بتائی تھی
کہ قدر ہوتی نہیں کوئی بن بلائے کی

پھر کسی لڑکی کی شادی ہو گئی قرآن سے
معجزہ تھا جس کو چھوٹی سی خبر سمجھا گیا

جو اچھے اور برے کاموں میں تھے ساتھی ہمارے
ہمیں کرنے لگے بدنام دیکھیں، کام دیکھیں

مذہب کو مانتا ہوں میں انسانیت کے بعد
انسانیت نہیں ہے تو انسان مسترد

خدا کے بندوں نے خود کو کیسا بنا لیا ہے
ہر اک نے اپنا الگ سے کعبہ بنا لیا ہے

صاحب منبر و مسند کی خبر ہے ہم کو
یہ بھی معلوم ہے کیا، کون، کہاں، بولتا ہے

جو سازشوں کا ہر طرف ہی جال ہے، کمال ہے
یہ آج کل جو دوستی کا حال ہے، کمال ہے

جس کے اندر کا ہی آدمی مر گیا
سوچتا ہوں وہ کیا رہ گیا آدمی

جب پرانا درخت کٹ رہا تھا
ایک چڑیا دہائی دے رہی تھی

ڈاکٹر صغیر احمد صغیر کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ زمانے کے اسرار و رموز سے واقف ہیں جن کو آپ شاعری میں ڈھالنا اور پرونا جانتے ہیں۔ الفاظ کی اونچائیاں، نیچائیاں، رعنائیاں، گہرائیاں سب آپ پر عیاں ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا موازنہ دوسرے شعرا سے کیا جائے تو اشعار کہنے کے سلیقے میں بہت سی قدریں مشترک نظر آئیں گی۔ اقبال نے کہا:

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

اس مضمون کو ڈاکٹر صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

تم محبت کی حد بتا رہے ہو
کیا محبت کی بھی کوئی حد ہے

فیض کہتے ہیں:

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

ڈاکٹر صاحب اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

اس کے رخسار اور لب آنکھیں
حسن ایسا کہ حسن کی حد ہے

اور غالب جیسی خود پسندی:

مجھ ایسے سرپھرے کا سر جھکانا سامنے اس کے
صفیر اے کاش وہ میرا پسندیدہ نہیں ہوتا

احمد فراز کا انداز:

جانے والے کو نہ روکو کہ بھرم رہ جائے
تم پکارو بھی تو کب اس کو ٹھہر جانا ہے

یہی بات ڈاکٹر صاحب کچھ اس انداز میں کہتے ہیں:

تم نے جانا ہے شوق سے جاؤ
جانے والے کو روکتا نہیں میں

نقش لائلپوری کا لکھا فلمی گیت:

یہ ملاقات اک بہانہ ہے
پیار کا سلسلہ پرانا ہے

ڈاکٹر صاحب کے یہاں یہ مضمون کچھ اس طرح ملتا ہے:

وہ جب ملے تھے محبت یہ تب سے تھوڑی ہے
جنم جنم کا تعلق ہے اب سے تھوڑی ہے

ہر شاعر کی شاعری کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ جس طرح میر درد کا صوفیانہ انداز، غالب کی خود پسندی اور پروین شاکر خوشبو کے لیے شہرت رکھتی تھیں اسی طرح مجھے یوں لگتا ہے ڈاکٹر صاحب کی شاعری خاموشی کے گرد گھومتی ہے۔ خاموشی پر آپ کو لاتعداد اشعار ملیں گے جو تمام ہی لاجواب ہیں ملاحظہ فرمائیں:

ایک مدت رہی تھی خاموشی
اور پھر خامشی بنی آواز

مری خامشی کے سوال سن، مرا حال سن
مرے دل میں ہے جو ملال سن، مرا حال سن

دل میں اک شور تھا قیامت کا
اور باہر سے میں لگا خاموش

اس کے آنے کی دیر تھی صاحب
سب کے سب ہو گئے حسیں خاموش

آخر میں ڈاکٹر صاحب کے اس شعری مجموعے "مراد تو ہے" کی آمد سعید پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دینا چاہوں گی۔ ہماری اللہ سے یہ دعا ہے کہ مراد تو ہے شہرہ آفاق کامیابیاں اور کامرانیاں سمیٹے کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

☆☆☆☆☆

گول میز کانفرنسیں، چودھری رحمت علی اور مطالبہ پاکستان

''برعظیم ہندو پاکستان کے مسلمان ہمیشہ خود کو ہندوؤں سے الگ، ایک جداگانہ وحدت تصور کرتے رہے اور 1857 کے بعد جب انگریزوں اور ہندوؤں کے گٹھ جوڑ نے مسلمانوں پر بے رحمانہ یلغار شروع کی تو مسلمانوں کے جسد سیاست نے جو اپنی بقا کے مسئلے سے دوچار تھی اپنی نجات اور رہنمائی کے لئے چاروں طرف نظریں دوڑانی شروع کیں۔ سرسید احمد، شبلی اور حالی نے مسلمانوں کے ''وقار گم گشتہ'' کے احیا کی جدوجہد اور ان لوگوں کی رہنمائی کی کوشش کی جو مملکت سمیت اپنا سب کچھ کھو چکے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ خدمت بجائے خود بڑی گراں قدر تھی، لیکن یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ موجودہ صدی کے اوائل میں کسی نے دنیا کے سامنے وہ سیاسی تصور پیش کرنے کی جرأت نہ کی جو برّعظیم کے کروڑوں مسلمانوں کے لیے ایک وطن کے حصول کا ضامن بن سکتا، جسے وہ اپنا کہہ سکتے، جہاں وہ ایک خودمختار قوم کی طرح عزت اور آبرو کی زندگی گزار سکتے اور جہاں وہ اپنی زندگیوں کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھال سکتے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں مسلمانوں کی قیادت یا تو برطانیہ کی وفادار تھی یا پھر کانگریس سے وابستہ تھی۔ جس پر ہندوؤں کا غلبہ تھا اور جو انڈین نیشنلزم کے نام پر مسلمانوں کو ان کے تحفظ کا جھوٹا یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قائداعظم بھی ایک زمانے میں کٹر نیشنلسٹ اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے''۔ ان دنوں نیشنلسٹ ہونا تقریباً فیشن میں شامل تھا اگر کوئی شخص اسلام یا مسلمانوں کے حوالے سے کوئی بات کرتا تو اسے نہایت حقارت کے ساتھ تنگ نظر اور فرقہ پرست کہہ کر خاموش کر دیا جاتا تھا اس وقت رحمت علی کی اکیلی آواز تھی جس نے گول میز کانفرنسوں میں شرکت کرنے والے مندوبین کو ان خطرات سے متنبہ کیا، جو اس برصغیر کے مسلمانوں کو ''انڈین فیڈریشن'' میں شمولیت میں لاحق ہوتے''۔

''آئینی کمیشن، جسے عام طور پر اس کے صدر سرجان سائمن کے نام پر سائمن کمیشن کہا جاتا ہے۔ لارڈ برنہم، لارڈ اسٹریتھ کونا اور ماونٹ رائل، ایڈورڈ کیڈوگن، اسٹیفن والش، رچرڈ لین فاکس اور سی۔ آر ایٹلی پر

جمیل حسین کھٹانہ

مشتمل تھا۔ بعد میں والش نے استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ ورنان ہارٹ شارن کا تقرر ہوا۔ کمیشن نے فروری، مارچ 1928 میں اور پھر اکتوبر 1928ء، اپریل 1929 میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ اس کمیشن کے تقرر پر ہندوستانی ردعمل ملا جلا تھا۔ ہندوستانی مجلس قانون ساز نے اس کے مقاطعے کی قرارداد منظور کی مگر مجلس مملکت نے اس کے ساتھ تعاون کا فیصلہ کیا۔ کانگریس کمیشن کے غیر مشروط مقاطعہ کے حق میں تھی مگر نیشنل لبرل فیڈریشن، جدولی اقوام کی فیڈریشن، ہندوستانی عیسائیوں، پارسیوں اور دوسری چھوٹی اقلیتوں نے اس کے ساتھ کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ مسلم لیگ میں دو رائے تھیں۔ ایک بازو جس کے قائد محمد علی جناح تھے، کانگریس کے ساتھ تھا اور اس نے کمیشن کا مقاطعہ کیا اور دوسرے بازو نے جس کی قیادت سر محمد شفیع کر رہے تھے تعاون کو پسند کیا۔۔۔ سائمن رپورٹ مئی 1930 میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد میں پورے ہندوستانی مسئلے کا جائزہ لیا گیا تھا اور دوسری جلد میں کمیشن کی سفارشات اور تجاویز پیش کی گئی تھیں"۔

"۔۔۔ برطانیہ قدامت پسند پارٹی کو عام انتخابات میں شکست ہوئی اس کی جگہ لیبر پارٹی برسر اقتدار آ چکی تھی۔ نئے وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ مقرر ہوئے۔ قائداعظم نے وزیر اعظم کو ایک طویل خط لکھا جس میں سائمن کمیشن کے مقاطعے، ہندوستان کے دستوری مسائل اور اس وقت کی سیاسی صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے چند سفارشات کیں۔ انہوں نے برطانوی حکومت کو مشورہ دیا کہ بہتر ہوگا اگر سائمن کمیشن کی رپورٹ پر مسودہ آئین کی تیاری سے قبل ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ افہام وتفہیم ہو جائے۔ اس خط کا خاطر خواہ اثر ہوا اور حکومت نے ہندوستانی نمائندوں کی کانفرنس بہت جلد بلانے کا اعلان کر دیا۔ اس سلسلے میں تین کانفرنسیں منعقد ہوئیں"۔

"9 جولائی 1930 کو وائسرائے ہند نے اسمبلی و کونسل آف سٹیٹ کے ممبروں کو مخاطب کیا اور بتایا کہ یہ اسمبلی کا آخری سیشن ہے اس سال الیکشن ہوں گے۔ دوسری بات یہ بتائی کہ لندن میں گول میز کانفرنس ہوگی جس میں ہندوستان سے نمائندے بھیجے جائیں گے جو وہاں سائمن کمیشن کی تجاویز پر انگریزی نمائندوں سے گفت وشنید کریں گے۔ 10 جولائی کو وزیر مال ہند نے مزید روپیہ طلب کیا جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس جو لوگ جا رہے ہیں ان پر خرچ ہوگا"۔

پہلی گول میز کانفرنس

"گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس 12 نومبر

1930 کو ہاؤس آف لارڈز کی رائل گیلری لندن میں منعقد ہوا۔ اس کے بعد یہ کانفرس وقفوں وقفوں کے بعد 19 جنوری 1931 تک جاری رہی"۔

اس کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے شاہ جارج پنجم سے خطاب کیا تھا۔

اس کانفرنس میں مجموعی طور پر 72 ہندوستانی مندوبین نے شرکت کی ان میں سولہ مسلمان تھے۔ مسلمان مندوبین میں ہز ہائی نس سر آغا خان، مولانا محمد علی جوہر، قائد اعظم محمد علی جناح، نواب چھتاری، شیر محمد خاں، سر شاہنواز، اے کے فضل الحق، حافظ ہدا شاہین، سر غلام حسین ہدایت اللہ، سرائے۔ کے غزنوی صاحبزادہ سر عبدالقیوم خاں سر میاں محمد شفیع، سید سلطان احمد، ڈاکٹر شفاعت احمد، چودھری ظفر اللہ خاں اور بیگم شاہنواز شامل تھے"۔ اس کانفرنس میں ایک عظیم سانحہ یہ پیش آیا کہ مولانا محمد علی جوہر جنہوں نے ایک دردمند حریت پسند، بے باک اور مخلص رہنما اور سچے مسلمان کے طور پر آزادی ہندوستان کے طور پر آزادی ہندوستان کے لیے طویل جدوجہد کی تھی انتقال فرما گئے اور انہیں قبلہ اول (بیت المقدس) میں دفن کیا گیا"۔

"کانگریس نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ جنوری 1930 میں کانگرس نے یوم آزادی منایا اور علان کیا کہ جب تک ہندوستان کے عوام کو کامل آزادی نہیں مل جاتی اس وقت تک تحریک سول نافرمانی جاری رہے گی — جب یہ کانفرنس شروع ہوئی تو اس میں اگرچہ کانگریس کی نمائندگی کرنے والا کوئی نہ تھا لیکن وزیر اعظم برطانیہ اور وزیر ہند کے رویہ سے یہ بات بالکل صاف نظر آ رہی تھی کہ کانگریس کی عدم موجودگی میں وہ خود کانگریس کا موقف بیان کریں گے۔ برطانوی وزیر اعظم ریمز سے میکڈونلڈ نے اقلیتوں کے تحفظات کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں "نیشنلزم کے نظریے" کو بھی دہرایا"۔

"— اجلاس میں متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان میں وفاقی طرز کی حکمت ہو گی۔ سر تیج بہادر سپرو کے کہنے پر انگریز نے اس بات کو بھی تسلیم کر لیا کہ ہندوستان میں مرکزی طور پر ایک ذمہ دار حکومت بنائی جائے اور ہندوستان کو قلم رو کا درجہ دیا جائے۔ سر تیج بہادر کی اس تجویز کو مسلم لیگی زعما نے بھی مان لیا"۔

"چودھری رحمت علی کے لئے یہ بات بے حد پریشانی کا موجب تھی کہ مسلمان قائدین سیاسی صورتحال کا صحیح طور پر اندازہ نہیں کر رہے تھے اور وہ ہندوستان کی مرکزی

حکومت کو نئے سیاسی اور آئینی نقشہ میں تسلیم کرنے پر آمادہ تھے۔ چودھری رحمت علی اس حقیقت سے آشنا تھے کہ مرکزی حکومت کا ایک باس تسلط ہو جائے تو صوبائی حکومتیں پھر اس کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں۔ چودھری رحمت علی محسوس کر رہے تھے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان میں آزاد اسلامی ریاست کے لئے آواز بلند کی جائے۔ وہ اس حقیقت کو بھی محسوس کر رہے تھے ہندوستانی مسلمانوں کی کوئی سیاسی منزل نہیں ہے۔ خلافت ختم ہو چکی ہے محض آئینی تحفظات کے بغیر قوم کی حیثیت بھٹکے ہوئے کارواں کی ہوتی ہے۔ جب منزل کی نشاندہی ہو جائے تو کارواں ملت کی جانب جادہ پیما ہوتا ہے"۔

دوسری گول میز کانفرنس

دوسری گول میز کانفرنس 7 ستمبر تا یکم دسمبر 1931 تک جاری رہی۔ اس کانفرنس میں مسٹر گاندھی "گاندھی اروِن پیکٹ" کے تحت اجلاس میں شریک ہوئے۔ مولانا محمد علی جوہر کی جگہ ڈاکٹر محمد اقبال کو مدعو کیا گیا۔ مسٹر گاندھی نے کانفرنس کے پہلے دن سے نہایت قابل اعتراض رویہ رکھا۔ انہوں نے خود کو پورے ہندوستان کا واحد نمائندہ قرار دیا۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ ہندوستان میں اگر کوئی سیاسی جماعت ہے تو محض کانگرس ہے۔ باقی تمام جماعتیں ذیلی جماعتیں ہیں"۔ اس گول میز کانفرنس میں دو کمیٹیاں مقرر کی گئی تھیں۔ ایک کمیٹی اقلیتوں کے مسائل سے متعلق تھی جب کہ دوسری وفاق --- کے بارے میں غور کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ اب کی بار مسلم وفد کے سربراہ سر آغا خاں تھے۔ علامہ اقبال بھرپور مدد اور رہنمائی کرتے رہے"۔

تیسری گول میز کانفرنس

تیسری گول میز کانفرنس 17 نومبر 1932 شروع ہوئی اور 24 دسمبر 1932 کو ختم ہو گئی اس اجلاس میں کانگرس نے شرکت نہ اس کی وجہ واضح تھی کانگرس نے ہندوستان میں نافذ کی جانے والی آئینی اصلاحات کے سلسلے میں انگریز -- کا جائزہ لے لیا تھا اور اسے پتہ چل گیا تھا یہ اصلاحات بہت جلد نافذ ہونے ہونے والی ہیں"۔ قائد اعظم دوسری اور تیسری گول میز کانفرنسوں میں شریک نہیں ہوئے۔ حالانکہ وہ لندن میں موجود تھے۔ انہوں نے پہلی گول میز کانفرنس کے بعد لندن میں وکالت شروع کر دی تھی۔

لندن میں منعقدہ اس تیسری گول میز کانفرنس میں ہندوستان کے نئے آئن کے بارے میں بھرپور بحث مباحث ہوئی اور اس مباحث میں یہ مان لیا گیا تھا کہ آئین

میں ہندوستان کی اقلیتوں اور جاتیوں کو بھی آئینی تحفظات فراہم کئے جائیں گے۔اس کانفرنس کے اختتام پر علامہ اقبال نے ملک واپس آکر اس گول میز کانفرنس کے بعض فیصلوں کی وضاحت فرمائی اور پھر 27 فروری 1933 کو انہوں نے ''مسلم نیوز سروس'' کے نمائندے کو تفصیلات بتاتے ہوئے فرمایا:

''میں امید کرتا ہوں کہ ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیاں اس آئین کو جو گول میز کانفرنس میں وضع کیا گیا ہے کامیاب بنانے کی کوشش کریں گی۔ ہندوستان کے لئے یہی بہترین راستہ ہے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو انتخابات کے لئے منظم کریں اور اپنی جماعت میں تفرقہ پیدا نہ ہونے دیں''۔

چودھری رحمت علی فرماتے ہیں:

''میں نے مسلمان راہنماؤں کو خبردار کیا کہ ان کا یہ اقدام ہمارے مشن کی کامیابی کی تمام امیدیں خاک میں ملادے گا۔میں نے مسلمان زعما کی منت سماجت کی اور کہا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داری کا احساس کریں اور ''وفاق ہند'' کے قیام کا مطالبہ سے دستبرداری کا اعلان کردیں۔ اور اس کی جگہ ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں ایک علیحدہ آزاد ملک کے قیام کا مطالبہ کریں لیکن میری تمام تر کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور کسی نے اس بات کی اہمیت کا احساس نہ کیا اور نہ ہی اس کی حمایت میں کسی ردعمل کا اظہار کیا۔مایوسی کے باوجود مجھے امید تھی کہ شاید ایسا سیاسی راہنما جو کانفرنسوں میں شریک نہ ہو اس تجویز یعنی وفاق ہندوستان کے قیام کی مخالفت کرے گا لیکن دوسری گول میز کانفرنس کے انعقاد تک کوئی بھی سامنے نہ آیا۔میرے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ اس قدر مقدس فریضہ کی ادائیگی کے لئے کوئی بھی سامنے نہیں آرہا''۔

ڈاکٹر عبدالرحیم ، ایم اے ۔پی ایچ ڈی (لندن) سابق صدر ہائی کورٹ پشاور جو نومبر 1932 میں اپنی تعلیم مکمل کر کے انگلستان سے انڈیا آئے تھے۔وہ گول میز کانفرنسوں کے سالوں میں انگلستان میں طالب علم تھے ان کا تعلق خیبر یونین سے تھا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ:

قائداعظم محمد علی جناح اس زمانے میں لندن میں پریکٹس کر رہے تھے اور انہوں نے اپنی رہائش کے لئے (Burk-Hampstead) میں مکان خریدا ہوا تھا۔ہم لوگوں نے ان سے ملاقات کے لئے ایک وفد تشکیل دیا اس وفد (چودھری رحمت علی، محمد اسلم خاں خٹک، ڈاکٹر عبدالرحیم وغیرہ) نے قائداعظم کی رہائش گاہ پر جا کر ان سے ملاقات کی۔

قائداعظم نے وفد کا بڑی خوش دلی سے استقبال کیا اور وہ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ لیکن جب وفد نے ان کی خدمت میں ''تقسیم کا نظریہ'' پیش کیا تو ہنس پڑے اور ہمیں یاد دلایا کہ:

''Mrs. Sarojini Nidu'' مسز سروجنی نائڈو۔ بلبل ہند نے اتحاد کے سفیر کے طور پر ہمیں دریافت کیا ہے اور پھر کچھ یوں فرمایا کہ: ''انگریز نے مختلف لوگوں کو اکٹھا کر کے ایک ملک بنایا ہے اور تم اس کو توڑنا چاہتے ہو! ہم لوگ ان کی باتیں سن کر وہاں سے واپس آ گئے۔ ان کی طرح دیگر ممتاز مسلمان رہنماؤں اور انگریز سیاستدانوں نے بھی ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا''۔

محمد اسلم خاں خٹک نے انٹرویو دیتے ہوئے اسرار احمد کسانہ کو بتایا:

''قائداعظم ان دنوں لندن میں پریکٹس کر رہے تھے اور وہ لندن میں ٹھہرے ہوئے تھے ہمارا ایک وفد ان سے ملنے گیا جس میں چودھری رحمت علی بھی تھے اس وفد نے قائداعظم کی خدمت میں ''تقسیم ملک'' کی تجویز پیش کی، جس کو پڑھ کر انہوں نے ہمیں خوب ڈانٹا اور دبایا۔ قائداعظم فرمانے لگے: انگریز نے اپنی ذہانت سے ایک ہی نیک کام کیا ہے کہ اس نے مختلف اقوام کو اکٹھے کر کے ایک ملک بنایا ہے اور تم اس کو توڑنے پر لگے ہوئے ہو۔ میں اس تجویز کو قطعاً نہیں مانتا میں تو ''Prince of Peace'' ہوں۔

اور پھر فرمایا:

Keep away from it,

Keep away from it,

(یعنی اس سے دور رہو، اس سے دور رہو)

ڈاکٹر عبدالرحیم اور اسلم خان خٹک کے بیانات سے محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت چودھری رحمت علی اور ان کے ساتھیوں نے قائداعظم کے ساتھ جو ملاقات کی تھی، اس کا مقصد یہی تھا کہ قائداعظم آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی رہنما کی حیثیت سے ''تقسیم ہند'' کا نظریہ پیش کریں لیکن انہیں قائداعظم کا جواب سن کر مایوسی ہوئی۔

نامور شاعر ادیب اور صحافی رئیس امروہوی (مرحوم)، چودھری خلیق الزمان ناظم اعلیٰ کنونشن مسلم لیگ کی کتاب ''ہاتھ دے تو پاکستان'' کے حوالے سے ان کا یہ بیان تحریر کرتے ہیں:

''ایک روز لندن میں چودھری رحمت علی نے جنہوں نے پاکستان کی اصطلاح وضع کی تھی مجھے چائے پر مدعو کیا۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ اور اس پہلی ملاقات ہی میں اس طویل القامت، شاندار اور خوش وضع جوان نے مجھے متاثر کر لیا۔ جب پاکستان کے

موضوع پر گفتگو شروع ہوئی تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس شخص نے نہ صرف پاکستان کے موضوع پر گہرا مطالعہ کیا ہے بلکہ وہ اس تحریک کی کامیابی کا بھی پکا یقین رکھتا ہے"

چودھری خلیق الزمان کے بیان کے مطابق، رحمت علی مرحوم نے پہلی گول میز کانفرنس کے موقع پر "تقسیم ہند" کی تجویز مسلم لیگی رہنماؤں کے سامنے رکھی تھی۔ لیکن اس وقت کسی نے بھی اس کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ چودھری صاحب (چودھری خلیق الزمان) نے اس امر پر اظہار افسوس کرنے کے بعد کہا کہ مسلم ہند نے اس قابل تخلیقی ذہن رکھنے والے نوجوان کی قدر نہ کی۔ انہوں نے اس امر کا اعتراف بھی کیا ہے کہ پہلے پہل پاکستان کا لفظ ان کی سمجھ میں نہ آیا تھا لیکن چودھری رحمت علی اس لفظ کی معنویت پر اصرار کرتے رہے (اور تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اس لفظ کے بارے میں مرحوم کا وجدان اور ایقان کتنا صحیح تھا"۔

پاکستان کے سابق وزیر خزانہ، امریکہ میں پاکستان کے سابق سفیر، یو این او میں پاکستان کے سابق یونی نسٹ پارٹی کے سابق پرائیویٹ سیکرٹری، دوسری اور تیسری گول میز کانفرنسوں میں شرکت کرنے والے مسلم وفد کے سیکرٹری، سید امجد علی نے مورخہ 22 مئی 1996 کو اپنی رہائش "آشیانہ" واقع گلبرگ لاہور میں اپنے ایک انٹرویو میں اسرار احمد کسانہ کو بتایا کہ:

"اس زمانہ میں گول میز کانفرنسوں میں شرکت کے لئے انڈیا سے بڑے بڑے راہنما وفد کی صورت میں لندن جاتے تھے۔ میں دو مرتبہ مسلم وفد کے ساتھ سیکرٹری کے طور پر دوسری اور تیسری گول میز کانفرنسوں میں شرکت کے لئے لندن گیا تھا۔ اس وقت انڈیا کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگریس تھی گو اس وقت مسلم لیگ اتنی بڑی جماعت نہیں تھی لیکن کانگریس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ ہی تھی اس لیے برطانوی حکومت اسے اہمیت دیتی تھی۔

مجھے دونوں گول میز کانفرنسوں (یعنی دوسری اور تیسری) کے موقع پر چودھری رحمت علی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ چودھری رحمت علی کیمبرج کے طالب علم تھے۔ اس وقت وہ ہر مسلمان لیڈر سے ملتے تھے جو لندن میں موجود ہوتا تھا۔ پاکستان اسکیم کو وہ بڑے سیاسی نقطہ نگاہ سے بیان کرتے تھے۔ وہ مسلمان رہنماؤں سے مطالبہ کرتے تھے کہ وہ پاکستان کا مطالبہ انگریز کے سامنے پیش کریں اور ہندوؤں کے سامنے پاکستان کے حصول کا کھل کر اظہار کریں۔ چونکہ گول میز کانفرنسوں میں انڈیا کے سیاسی مسائل پر بات چل رہی تھی اس لیے اس وقت مسلم وفد کا کوئی بھی رکن "پاکستان"

جیسے متنازع موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے تیار نہ ہوا"۔

"غالباً تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے دنوں میں چودھری رحمت علی نے "ناؤ آر نیور" کے نام سے ایک چھوٹا سا پمفلٹ تقسیم کیا تھا۔ جس میں پاکستان سے متعلق انہوں نے اپنا نقطہ نظر اور موقف کھل کر بیان کیا تھا۔ اس مضمون کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ایک تصوراتی کہانی ہے"۔

ناؤ آر نیور کی اشاعت

جب خدا تعالیٰ کسی قوم کو نوازنا چاہتا ہے اور اس کو پستی سے نکال کر بلندی پر پہنچانا چاہتا ہے تو وہ اس امر کو پایہ تکمیل پر پہنچانے کے لئے اسباب مہیا کرتا ہے اور ان اسباب کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم منشائے خداوندی کے مطابق حرکت میں آتی ہے اور قانون قدرت کے مطابق اس قوم کو حرکت میں لانے والا کوئی نہ کوئی فرد ضرور وجود میں آتا ہے۔

ایسا ہی ایک دیدہ ور اور بطل جادہ حریت چودھری رحمت علی کے روپ میں پیدا ہوا۔ جس نے برصغیر کی مسلم قوم کو انگریز کی محکومیت اور ہندو کی بالادستی سے نجات دلانے کے لیے پاکستان نعرہ مستانہ بلند کیا۔ چودھری رحمت علی 1915 میں ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں پر مشتمل ایک علیحدہ اسلامی مملکت کے قیام کا "نظریہ پیش" کر چکے تھے لیکن انہوں نے اپنے اس نظریہ کو 1933 میں "پاکستان" کا نام دیا اور اس "نظریہ پاکستان" کو پمفلٹ ناؤ آر نیور میں متعارف کرایا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب انگلستان میں گول میز کانفرنسیں ہوئی تھیں۔ اور تیسری گول میز کانفرنس میں "کل ہندو فاق" کے خطوط پر آئین کی منظوری کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ "قبل اس کے چودھری صاحب گول میز کانفرنسوں میں شرکت کرنے والے مسلم رہنماؤں سے مل کر انہیں اپنا نقطہ نظر سمجھانے کی کوشش بھی کر چکے تھے اور اس بات پر انتہائی دل گرفتہ تھے کہ مسلمان لیڈر بلا سوچے سمجھے ہندو وطنیت کا شکار ہونے پر آمادہ ہیں"۔

محمد حسین زبیری تحریر کرتے ہیں کہ:

چودھری صاحب نے گول میز کانفرنسوں کے مسلم مندوبین سے الگ الگ ملاقاتیں کیں اور ان پر یہ بات واضح کی کہ انڈین فیڈریشن قبول کر لینے سے مسلمانوں کی انفرادیت ختم ہو جائے گی اور آپ اللہ اور سول کے سامنے جواب دہ ہوں گے لہٰذا انڈین فیڈریشن کو مسترد کر کے شمال مغربی وطن کے لئے ایک الگ وفاق کا مطالبہ کریں۔

چودھری صاحب کی یہ تمام کوششیں رائیگاں گئی اور مسلم مندوبین کا احساس بیدار نہ ہوا بلکہ اس تجویز کی مخالفت شروع کی گئی اور سب نے آل انڈیا فیڈریشن کو قبول کر لیا"۔

چودھری صاحب نے ناؤ آر نیور (اب یا کبھی نہیں) 32-1931 میں تیار کرلیا تھا اور اس کو نمائندہ حیثیت دینے کے لئے اس پر محمد اسلم حان خٹک خیبر یونین عنایت اللہ خان آف چارسدہ، جنرل سیکرٹری خیبر یونین اور صاحبزادہ شیخ محمد صادق کے دستخط بھی حاصل کر لئے تھے۔ ناؤ آر نیور پر دستخط کرنے والوں میں چودھری رحمت علی کے دستخط سرفہرست تھے۔

چودھری صاحب نے اس پمفلٹ کی باقاعدہ اشاعت 28 جنوری 1933 کو عیدالفطر کے دن اپنے گھر کے پتہ۔ ہمبر سٹون روڈ کیمبرج، انگلستان سے کی تھی۔ اس پمفلٹ کی اشاعت کے وقت پمفلٹ کے ساتھ چودھری صاحب نے اپنے دستخطوں سے ایک الگ لیٹر بھی لگایا تھا۔ اس لیٹر میں ان کی طرف سے مسلمانوں کے لئے الگ خطہ ارضی ''پاکستان'' کے حصول کے لئے اپیل کی گئی تھی۔

چودھری صاحب نے ناؤ آر نیور 32-1931 میں شائع کیوں نہیں کیا؟ اس سوال کا جواب حالات وواقعات سے ملتا ہے کہ چودھری صاحب یہ چاہتے تھے کہ گول میز کانفرنسوں میں شرکت کرنے والے مسلم رہنما ہی ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں پر مبنی ایک علیحدہ وفاق کا مطالبہ کریں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اکثر مسلمان رہنماؤں سے ملاقاتیں بھی کیں اور انہیں قائل کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن جب چودھری صاحب مسلمان رہنماؤں کی جانب سے مایوس ہوگئے تو انہوں نے پاکستان کے حصول کے لیے خود عملی جدوجہد کرنے کا عزم کرلیا۔ یہ مشیت ایزدی تھی کہ ''مطالبہ پاکستان کا فریضہ چودھری صاحب کے ہاتھوں سے ہی سرانجام پانا تھا اور پاکستان کی بنیاد رکھنا چودھری رحمت علی کا مقدر بن چکا تھا۔

ناؤ آر نیور چودھری صاحب کی ایک ایسی نادر تخلیق ہے جو ''پاکستان'' کے قیام کے سلسلہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ 28 جنوری 1933 کو چودھری رحمت علی نے اس پاکستان کی بنیاد رکھ دی، جس پر ابھی چودہ سال چھ ماہ اور سولہ دن بعد پاکستان کی عمارت تعمیر ہونا تھی۔

ایک مضمون نگار لکھتے ہیں:

دنیا کی تاریخ میں ایسی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جنہوں نے دنیا کا نقشہ پلٹ دیا۔ روسو کی کتاب '' Social Contract'' انقلاب فرانس برپا کرنے کے اسباب میں شمار ہوتی ہے۔ ٹامس پین کا کتابچہ '' Common Sense'' امریکہ کی آزادی کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ مسٹر ہیرٹ ہیمپر اسٹو کی

کتاب "Uncle Tom's Cabin" امریکہ میں غلامی کے خاتمہ کا سبب بنی تھی اور ہٹلر کی خودنوشت "Mein Kempf" دوسری جنگ عظیم کا باعث سمجھی جاتی ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں یہی درجہ چودھری رحمت علی کے مختصر کتابچہ "Now or Never" کا ہے، جو 1933 میں شائع ہوا اور چند ہی برسوں میں ہندوستان کے ہر مسلمان کے دل کی دھڑکن بن گیا۔ یہ کتابچہ نہ صرف بر صغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد وطن پاکستان کے قیام کا باعث بن گیا بلکہ اسے ایک خوبصورت اور بامعنی نام بھی عطا کر گیا۔ 14 اگست 1997 کو پاکستان کو قائم ہوئے پورے پچاس سال ہوئے۔ اس سال کو حکومت نے پاکستان کی گولڈن جوبلی کے طور پر منانے کا اعلان کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس گولڈن جوبلی کے سال میں حکومت وقت کو یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ جس تاریخ کو پاکستان کے نام کا اعلان ہوا اور جس تاریخ کو پہلی بار پاکستان کا مطالبہ کیا گیا اس تاریخ کو یعنی 28 جنوری کو قومی دن قرار دیا جائے۔ یہاں اس امر کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ 16 نومبر 1997 کا دن چودھری رحمت علی کے صد سالہ یوم ولادت کے طور پر بھی منایا گیا۔

چودھری رحمت علی کے نزدیک برصغیر ایک چھوٹا براعظم ہے۔ ان تمام علاقوں اور خطوں میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں، مسلمانوں کی علیحدہ مملکتیں قائم کی جائیں - جیسے صدیقستان، فاروقستان، عثمانستان، بانگ اسلام، موپلستان، معین ستان - ان مملکتوں کے بعد آپ نے برصغیر کا نام براعظم دینیہ تجویز فرمایا۔ 1947 سے قبل تو کسی نے ان تجاویز پر غور نہ کیا لیکن آج کے بھارت میں مودی کی حکومت جن پالیسیوں پر عمل پیرا ہے جلد یا بدیر چودھری رحمت علی کی پیشن گوئیاں حقیقت کا روپ دھاریں گی (ان شاءاللہ)۔ ہمارے متعصب مؤرخین نے تو چودھری رحمت علی کی خدمات کو فقط لفظ "پاکستان" تک محدود کر دیا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ آپ نے نام کے علاوہ پاکستان کا نقشہ، جھنڈا بھی تجویز کیا تھا۔ زندہ اقوام تو اپنے محسنوں کو ان کے مقام و مرتبہ کے مطابق جگہ دیا کرتی ہیں، ان کے افکار سے رہنمائی حاصل کیا کرتی ہیں۔ لیکن ہم نے ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کے بجائے ان کو وطن میں قیام کرنے اور دفن ہونے کی بھی اجازت نہیں دی، یہ ایک رحمت علی کے ساتھ ہی نہیں، طویل فہرست ہے اور ابھی کل کی بات ہے محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر کے ساتھ کیا کیا گیا----

☆☆☆☆☆

''آثار'' کے تازہ شمارے پر ایک تاثراتی نظر

''آثار'' کا شمار ایسے کتابی سلسلے میں کیا جانا چاہیے جس نے اردو ادب اور اس کے قارئین کے لیے جدید دور کے تقاضوں کو سمجھا ہے۔ فی زمانہ جب کہ بھرتی کے ادبی رسائل کی بھرمار ہے ''آثار'' نے ایک معیار متعین کیا ہے۔ اگر آپ کا ذوقِ ادب رچا ہوا اور مشاہدہ مطالعے کے قالب میں ڈھلا ہوا ہے اور آپ معیاری ادب پر کوئی سمجھوتہ قبول نہیں کرتے، آپ کی نگاہِ انتخاب طائرانہ بصیرت کی حامل بھی ہے تو آپ کو ضرور ''آثار'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ عصری رجحان اور تقاضوں کی اہمیت کو سمجھنے والے اس رسالے میں ہر اس قاری کے لیے سامانِ تسکین موجود ہے جو فی زمانہ ادبی رسائل کے زوال پر تشویش کا شکار ہے اور ایسے رسالے کا متلاشی اور آرزومند رہتا ہے جس میں قدیم و جدید کا امتزاج فنی حسن کے ساتھ حسِ جمال کی تسکین کا بھی سامان کرتا ہو۔

اگر آپ محض تفننِ طبع کی خاطر چلبلی شاعری کے متلاشی ہیں، سطحی رومان زدہ کہانیاں پڑھ کر حقیقی دنیا کے بکھیڑوں پر نالاں ہیں اور ادب کو محض وقتی طرب کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو ''آثار'' آپ کے لیے ہرگز نہیں ہے!

فی زمانہ جب کہ رسالہ نکالنا ایک فیشن اور فراغت کا شغل بے کار بن کر رہ گیا ہے، اور ہر بو الہوس کے حسن پرستی شعار کرنے کے مصداق یہ شوق بھی لوگوں کو فیشن کے طور پر اپنانا پڑتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے کچھ فارغ احباب اکٹھے ہوئے، بھرتی کی شاعری کا انبار فراہم کیا، افسانوی ادب کے نام پر ایک لمبی فہرست بنائی، بھرتی کے تراجم، حکایات اور

فضیلت حسین

فکاہیات شامل کیں اور ایک عدد رسالہ وجود میں آ گیا، نام ونمود اور شہرت بھی مل گئے! ایسی مصنوعی اور حریص فضا میں ''آثار'' کی پوری ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے کہ (یہ تمام احباب خود بھی صاحبانِ کمال ہیں) انہوں نے اعلیٰ ذوق کے حامل گم ہوتے ہوئے قافلے کو از سرِ نو ایک ''بانگِ درا'' سنائی ہے۔ مشکل اور طویل سفر اختیار کیا مگر معیار اور خلوص پر کوئی سمجھوتا گوارا نہیں کیا۔

مجھ سے قاری جو کم کوشش تو ہوں مگر بے ذوق نہیں، کے لیے ایک دقت یہ بھی ہے کہ اگر کبھی فرصت اور کچھ اچھا پڑھنے کی خواہش تو بالعموم رسالہ اس لیے بھی اہم ہوتا ہے کہ اس میں کتاب کی نسبت بہت سے لکھاریوں کی تحریر دیکھنے کی سہولت ہوتی ہے یوں ایک اچھا کتابی سلسلہ ''جام جہاں نما'' ہوسکتا ہے مگر ان رسائل میں ایسا کچھ نہیں ہوتا جو آپ کے ذوق مطالعہ کو مہمیز کرے، بڑے بڑے اداروں کے چھوٹے چھوٹے (موٹے موٹے) رسائل جن میں دفتری حبس اور اقربا پروری کی گھٹن آپ کو بہت جلد بیزار کر دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں ''آثار'' کی ایک کاپی دستیاب ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ''آثار'' ماضی میں اپنی ایک روشن روایت رکھتا ہے اور اب پھر سے اس کا اجرا کیا گیا ہے۔ پڑھنا شروع کیا، ''ترتیب'' کے تحت موضوعات کی تقسیم اور ان کے عنوانات نے ایک گونہ کیفیت باندھ دی، ''درعشقِ سلیمانیم''، ''ایں کہن صہبا''، ''کاغذی ہے پیرہن''، ''دل پُرخوں کی اک گلابی سے''، ''نغمہ بیدل''، ''فراغتے وکتابے''، اگرچہ جدید دور کے اپنے تقاضے ہیں اور اردو ادب کا قلمکار اور قاری اس سے بیگانہ نہیں رہ سکتے تاہم فارسی اور اس سے اردو کی نسبت کی شیرینی اور دلکشی یہاں خاصے کی چیز بن کر ظاہر ہوئی ہے۔

اس سے آگے بڑھیے تو اداریے کا انوکھا پن اور طلسمی حسن آپ کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور ساتھ ہی آپ کو متنبہ بھی کرتا ہے کہ خبردار! اگر آپ ایک سرسری نظر رکھنے والے قاری ہیں تو آپ کے لیے یہ علاقہ ممنوعہ ہے۔ یہ وہ منفرد انداز تحریر ہے جو غالباً مدیر اعلیٰ ہی کی اختراع ہے۔ ایسی شعری جمالیات سے مزین تحریر جو اپنے اندر مکمل معنوی اکائی لیے ہو کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ اداریہ کیا ہے جدید حسیت کا پورا بیانیہ ہے۔ فیصل عجمی ادب کی دنیا یا شاعری میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ جدید حسیت ان کی شاعری کی پہچان ہے۔ ان کا لکھا ہوا اداریہ پڑھتے ہوئے آپ کو وہی

سرشاری ملتی ہے جو حسن کی حیرت سے خاص ہے۔ فیصل عجمی صاحب ادب کے رمز شناس تو ہیں ہی، وہ اس رسالے میں ایک ایسے قائد کی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں جنہیں اپنی ٹیم کی تشکیل میں بھی کمال حاصل ہے اور نگارشات کے انتخاب میں بھی۔ سو یہ گلدستہ ہر اعتبار سے انتخاب ہے۔ ''کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ'' کے عنوان سے تنقیدی مضامین گہری توجہ مانگتے ہیں کہ ان کے لکھنے والے صاحب نظر ہیں۔ ''زبانِ یارِ من ترکی'' میں بین الاقوامی ادب کے منظوم تراجم ہیں اور فرانز کافکا کی ایک کہانی کا ترجمہ، کیا ہی اچھا ہوتا اگر کم از کم نظموں کا اصل متن بھی شامل ہو جاتا۔ ترجمہ ہمیشہ سے ایک دلچسپ اگرچہ اپنی ثقاہت کے اعتبار سے متنازعہ سرگرمی رہی ہے۔ اس کے باوجود کسی ادب میں نئے رجحانات کے پیدا ہونے کی وجوہات میں سے ایک اہم وجہ خود ترجمہ ہے۔ میرے خیال میں اگر پوری نظم کا متن ممکن نہ تھا تو کم از کم نظموں کے اصل عنوان لکھ دینے سے بھی قاری کے لیے سہولت اور دلچسپی کا عنصر بڑھ سکتا تھا۔ نظم کے آخر میں پینٹنگز کے عکس لگائے گئے ہیں، جو جمال افزا ہیں۔

''تازہ واردان''، ''علاقائی زبانوں کا ادب''، ''نغمۂ بیدل'' کے تحت شاہد ماکلی صاحب نے، جو ''آثار'' کے مدیر بھی ہیں، تجزیاتی اور تعارفی مضامین لکھے ہیں اس کے لیے وہ خصوصی تحسین کے مستحق ہیں۔ جو رنگ اور انداز کتاب کے تجزیے کا انہوں نے متعارف کروایا ہے وہ منفرد اور بلیغ ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کتاب کا تجزیہ کرنا ایک تشریحی عمل بن جاتا ہے۔ اگر کتاب شاعری کی ہو تو پھر تو بس اِدھر شاعر کا تعارف پیش کیا، شاعری کی تعریف کی، اُدھر ایک شعر لکھا، نیچے دو تین پیراگراف اس کی تشریح میں لکھے، پھر چار پانچ اشعار لکھ کر اپنا موقف مضبوط کیا، چلو جی ہو گیا کتاب پر تجزیہ! مگر شاہد ماکلی صاحب سے کوئی سیکھے کہ کس طرح کتاب اور اس کے مندرجات پر تجزیے میں تخلیقی عمل سے گزرا جا سکتا ہے اور گزرا جانا چاہیے۔ ایک ایک جملہ نپا تلا اور معنوی تہہ داری کا حامل۔ تجزیہ بمشکل ایک صفحے کا اور پھر کلام شاعر زیادہ سے زیادہ! ''نغمۂ بیدل'' کی نغمگی اور مشکل کو جس حسن اور چابکدستی سے شاہد ماکلی نے اپنے منظوم ترجمے میں ڈھالا ہے اس پر سوائے داد اور رشک کے اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے۔ بیدل کے کلام کا متن بھی ساتھ ہے تو اس سہولت کے پیش نظر ترجمے

پر بات کرنا آسان ہو جاتا ہے۔
مجلاتی ادب کا اختصاص زمانہ موجود کے ادبی رجحانات اور میلانات کی خبر دیتا ہے۔ یوں یوں عصری ادب کی نمائندگی اور جدید طرز ادب کی عکاسی کسی بھی ادبی مجلّے کے اہم حوالے اور شناخت ہوتے ہیں۔ معاصر ادب کی نمائندگی ''آثار'' کا نہ صرف اختصاص ہے بل کہ اس کی انتظامیہ نے اس اہم ذمہ داری کو پوری ادبی روایت اور فکری بصیرت کے ساتھ نبھانے کی کوشش کی ہے۔
اس شمارے میں شاعری کا حصہ خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ اس کے صفحات میں جہاں جدید تر نظم کے نئے نئے شعری سانچے اپنی فکری اور جمالیاتی شکل میں جلوہ گر نظر آتے ہیں - وہیں فی زمانہ غزل کے موجودہ شعرا جدید غزل کا مزاج متعین کر رہے ہیں۔ کچھ اشعار تو پڑھتے ہی دل و دماغ پر نقش ہو گئے۔

سبیل کر تو سہی کوئی روکنے کی مجھے
تو مجھ پر ڈال دے چوری کسی پیالے کی
(آصف رشید امجد)

دھوپ میں چلتے ہوئے لوگ مرے دھیان میں ہیں
لطف کیا آئے مجھے زیرِ شجر بیٹھنے کا
(کاشف حسین)

محبت ہے خدا سے اور تجھ سے
وہ در ہے اور تو دیوار میری
(کاشف مجید)

بدن دراز تھا پیری کے بینچ پر لیکن
دل اٹھ کے بیٹھ گیا، جب کوئی حسین گزرا
(کبیر اطہر)

صرف فن کار ہی نہیں کوئی ادب یا ادبی مجلّہ اپنے عصر سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ عصری مسائل کسی بھی نوعیت کے ہوں ادب میں جگہ پاتے ہیں - جدید تر اردو نظم اپنے موضوعات ،طریقہ کار، تکنیک، شعری جمالیات اور مصرع سازی کی بنیاد پر کلاسیکل شاعری سے علیحدہ وجود رکھتی ہے۔ آثار میں نظموں کے انتخاب پر نظر ڈالی جائے تو ان نظموں میں جدید حسیت کا احساس قاری کو اپنی طلسماتی کشش میں لے لیتا ہے۔

ٹائم لائن

اس سے پہلے کہ گر دنا
خطِ تقویم کو ڈھانپ دے
وحشتِ امکاں کے آتش کدے میں کوئی آگ
پھر سے جلانی پڑے گی
آنے والے زمانے کی ساری مشینی کرامت،
اگلے وقتوں کی کل جینیاتی ذہانت،
یہیں پر اگانی پڑے گی

خاک زادوں کو اس خط پہ اپنی جگہ خود بنانے پڑے گی۔

(عابد رضا)

''تنقیدِ ادب'' سے متعلق لکھا گیا ادب ہے۔ یوں تنقیدی ادب میں ادب کی ترجمانی، تعریف و توصیف، حقائق کا تعین، صداقت کی تلاش اور تجزیہ و تشریح سب کچھ شامل ہے۔ ''آثار'' میں ڈاکٹر رشید امجد کا مضمون ''علی محمد فرشی کے طلسم کدے کی کلید'' اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا مضمون ''آدمی کائناتی ابتری کی روح ہے'' سے جدید اردو نظم کو سمجھنے کا شعور اور طریقہ پتا چلتا ہے۔ دونوں مضامین نظم، اس کے موضوع، تکنیک اور تفہیم سے متعلق ہے۔ اول الذکر میں علی محمد فرشی کی نظم پر بات کی گئی ہے جب کہ ثانی الذکر میں زاہد ڈار کی نظم موضوع مضمون ہے۔ دونوں مضامین کا مطالعہ قاری کی نظم کی جدید لفظیات اور مصارع کو پڑھنے کے حوالے سے رہنمائی کرتا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر دونوں حضرات اردو زبان و ادب کے معتبر حوالے ہیں۔ ان کا شمار اساتذہ فن میں ہوتا ہے۔ ان کی تنقید میں عالمانہ شان، شائستگی اور معنوی تہہ داری کے ساتھ ساتھ ایسا تدبر اور وقار موجود ہوتا ہے جو قاری کو بہت کچھ سیکھنے اور پڑھنے پر آمادہ کرتا ہے۔

اگرچہ ''آثار'' میں چند ادب پارے ایسے بھی ہیں جو اسلوب اور تاثر کے حوالے سے بہت نمایاں تو نہیں لیکن ادب کی روایت کو آگے بڑھاتے نظر آتے ہیں۔ تاہم افسانوی ادب کے حوالے سے مریم مجید کا افسانہ ''چھپر کھٹ کا ناگ'' ایک دلچسپ کہانی کا حامل افسانہ ہے۔ جو ایک ایسی عورت کے گرد گھومتا ہے جو ایک خدمت گزاری، اپنی وفاداری، حسن اور خلوص کے باوجود بھی اپنے شوہر اور ساس کو رام نہیں کر پاتی ہے۔ شمع جو ایک انتہائی خوبصورت عورت ہے۔ شادی کے بعد شوہر اور ساس اسے بلاجواز اذیتیں دیتے رہتے ہیں۔ نجات کی کوئی دوسری صورت نہ پا کر آخرکار وہ شوہر سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

''وہ بے خیالی میں زخمی سانپ کو دیکھے گی۔ اس میں اسے ساس اور شوہر کے خشونت زدہ چہرے اور زہریلے رویے نظر آنے لگے، آوارہ! بدکردار! لطیف کا زہر آلود لہجہ سماعت میں گونجا۔'' میری عقل پہ پتھر پڑ گئے تھے جو اس کم بخت ماری کو بہو بنا لیا۔ ساس کی پھنکار کانوں سے ٹکرائی --- شمع نے دھیرے دھیرے سانپ کو اس کے

پاؤں کی جانب بڑھایا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑی موم بتی سے سانپ کی لٹکتی دم کو آنچ دینے لگی۔ وہ دفعتاً تکلیف کی شدت سے تڑپا اور اس نے لطیف کے پیر کے انگوٹھے پر ڈس لیا، ایک بار، دو بار، وہ نیند میں ہلکا سا ہلا اور پھر سے ساکت ہو گیا۔''

پرچے میں اصناف کی تقسیم کے لیے جو عنوانات وضع کیے گئے ہیں ان کو دیکھ کر لگتا ہے کہ مدیران کا غالب رجحان غزل کی طرف ہے۔ کم و بیش تمام عنوانات غزلوں کے مصارع کے ٹکڑے ہیں۔ اور تو اور نظموں کے عنوان کو بھی ایک غزل کے مصرعے کے ٹکڑے سے موسوم کرتے ہیں ''کچھ اور چاہیے وسعت۔'' کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ عنوان جدید نظم کا کوئی ٹکڑا ہو جاتا۔ صہبائے کہن کی سرمستیاں اور سرشاریاں بجا مگر جدید قاری کے لیے ''کافی کا اردو'' بھی جدید حسیت کا استعارہ بن سکتا ہے۔ اگرچہ کلاسیکی ذوق کے حامل قارئین اسی طرح کے رچے ہوئے عنوانات پسند کرتے ہیں مگر کیا عجب کہ ایک زمانے کا فیشن یا رجحان دوسرے زمانے کا ''متروکہ'' ٹھہرے! سو یہ روایتِ قدیم کہ عنوانات کو غزلیہ ٹکڑوں کے تحت موسوم کیا جائے اپنی جگہ مستحکم سہی مگر کیا حرج ہے کہ جدید غزل کے لیے ''آتے ہیں غیب سے'' کے بجائے ''غزل دل کے گراموفون پر بجتی ہوئی'' رکھ دیا جاتا۔ مشرقی و عجمی خیالات کا طلسم اپنی جگہ مگر جدید نظم کا اپنا ایک اردو ما ہے سو نظموں کے انتخاب کو بھی کسی جدید نظم کے ٹکڑے سے منسوب کیا جا سکتا تھا۔

''آثار'' میں فکاہیات کی کمی کا احساس بھی رہا۔ یہ بہت سنجیدہ اور باوقار ادبی مجلّہ ہے مگر چند مزاحیہ مضامین اس کی دلچسپی میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

ایک خلا جو بار بار اپنی توجہ دلاتا ہے وہ یہ کہ خواتین اہلِ قلم کو بہت ہی کم جگہ دی گئی ہے اتنی کم کہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں! آئندہ شماروں میں اس کی گنجائش پیدا کر کے اس کے حُسن کو چار چاند لگائے جا سکتے ہیں۔

بہر حال اردو شاعری، تنقید، افسانوی ادب اور تراجم کے فروغ میں آثار کی خدمات موجودہ شمارے سے بخوبی مترشح ہیں۔ یہ مجلّہ بہت سنجیدگی سے اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ یہ ایسا رجحان ساز مجلوں میں شمار ہوتا ہے جو اپنے معاصر ادبی مجلوں کی نسبتاً زیادہ ارتکاز پسند ہے۔ بالخصوص معاصر ادب اور نو مشق ادیبوں کے لیے یہ ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہے۔

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا ''افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

شیخ زید کی رحیم یار خان آمد کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ۶۰ء کے اوائل میں آغا حسن عابدی ایوب خان کو ملا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ ابوظہبی کے کراؤن پرنس شیخ زید کو شکار کی دعوت دے۔ ایوب خان نے حیران کن نظروں سے آغا صاحب کو دیکھ کر کہا Where is Abu Zahbi آغا جی مسکرائے ''سر یہ ایک چھوٹی سی خلیجی ریاست ہے لیکن تیل نکلنے کی وجہ سے جلد ہی بہت اہمیت حاصل کرنے والی ہے۔ وہ دن بھی دُور نہیں جب یہ شہزادہ اس کا حکمران ہوگا۔'' ایوب خان کو آغا جی کی فراست پر یقین کامل تھا اس نے دوسرا سوال کیے بغیر

ہاں کر دی۔ ان دنوں شیخ زید کراچی آیا ہوا تھا۔ اسے سرکاری سطح پر دعوت ملی تو بہت خوش ہوا۔ اس کے پاس اپنا جہاز نہ تھا چنانچہ پی آئی اے کا فوکر چارٹر کیا گیا۔ وہ جب شیخ کو لے کر فضا میں بلند ہوا تو پاکستان ایئر فورس کے دو سیبر جیٹ طیاروں نے اس کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ عینی شاہدین کا بیان ہے کہ شیخ اس نظارے سے اس قدر محظوظ ہوا کہ کبھی کھڑکی سے ایک جہاز کو دیکھتا تھا اور کبھی دُوسرے کو۔

سکھر میں اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اس نے چند دن ایوب خان کے ساتھ گزارے اور میزبان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ سکھر سے بذریعہ ٹرین وہ رحیم یار خان آیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ سردیوں میں صحرائے چولستان میں تلور آتے ہیں۔ وہ کریم داد گجر کے گھر ٹھہرا۔ ان دنوں رحیم یار خان چھوٹا سا شہر تھا اور کوئی ڈھب کا ریسٹ ہاؤس بھی نہ تھا۔ شہر سے بارہ میل دور شکار کھیلتے ہوئے شیخ نے ریت کا بہت بڑا ٹیلا دیکھا اور کریم داد کو کہنے لگا "گجر بھائی! دیکھنا ایک دن میں اس ٹیلے پر بہت بڑا محل بناؤں گا۔" کریم دادا سے مجذوب کی بڑ سمجھ کر مسکرا دیا۔

ایک طویل عرصے سے چولستان کی Shifting sands کو کوئی کنٹرول نہ کر سکا تھا۔ تاریخی شواہد کے مطابق ہزاروں برس پہلے اس پر دریائے ہاکڑا بہتا تھا۔ دریا کے کنارے بستیاں آباد تھیں۔ لوگ خوش حال تھے۔ زراعت زرا گلتی تھی۔ پھلوں اور پھولوں کے درختوں نے چار سو سبز چھتریاں تان رکھی تھیں۔ بارشیں ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ ہوتی تھیں۔ گھی اور دودھ کی محاوراتی نہریں بہتی تھیں۔ بالآخر فلک ناہنجار کو لوگوں کی خوش حالی پسند نہ آئی۔ بارشیں رک گئیں، بادلوں نے منہ موڑ لیا، دریا گھٹتا گھٹتا محض ایک لکیر رہ گیا۔ چار سو ریت اُڑنے لگی۔ مرغزار ایک وسیع و عریض ریگ زار میں تبدیل ہو گیا۔ ۲۶۰۰۰ کلومیٹر پھیلے ہوئے اس صحرا میں ریت کی حکمرانی ہے۔ سالانہ بارش 126MM سے بھی کم ہے۔ آبادی گھٹتے گھٹتے اڑھائی لاکھ رہ گئی ہے۔ زیر زمین پانی اولاً کڑوا اور کھاری ہے پھر ۸۰ فٹ سے لے کر ۳۰۰ فٹ تک کھدائی کرنا پڑتی ہے۔ گرمیوں میں درجہ حرارت 50c تک چلا جاتا ہے۔

شیخ زید نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ اسی ریت کے ٹیلے پر ۱۹۷۰ء میں ایک شاندار محل تعمیر ہوا۔ ۱۴۵۴ ایکڑ پر پھیلے ہوئے اس پر شکوہ محل میں سو سے زائد کمرے ہیں۔ اس سے ملحقہ وائلڈ لائف پارک ۱۳۰۰ ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ آب حیات ڈسٹری بیوٹری سے محل کو پانی مہیا کیا جاتا ہے۔ محل ہر لحاظ سے دیدنی ہے۔ کمروں میں چار سو ایرانی قالین بچھے ہیں۔ تعمیر کے لئے ماربل اٹلی سے منگوایا گیا ہے۔ شینڈ لیئر فرانس سے درآمد کیے گئے ہیں۔ لکڑی برما سے آئی ہے۔ سب وڈ

ورک بر ماٹیک کا ہے۔ مرکزی ڈرائنگ روم میں سو سے زیادہ مہمان بیٹھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ڈائننگ ٹیبل پر اسی قدر لوگ بیک وقت کھانا کھا سکتے ہیں۔ محل جانے کے لئے تین دروازے ہیں۔ پہلے دروازے سے لے کر محل کی مرکزی عمارت کا فاصلہ ایک میل ہے۔ سڑک کے دو رویہ کھجور کے درخت ہیں۔ اس کے پودے عرب سے آئے ہیں۔ اموی حکمران عبدالرحمٰن اول ہو یا شیخ زید کھجور ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ان کے پیچھے آم اور سٹرس فروٹ کے باغات ہیں۔ محل سے باہر گیراج ہے جہاں ۲۵۰ گاڑیاں کھڑی ہیں۔ رولز رائس مرسیڈیز اور بی ایم ڈبلیو کاریں رینج روورز، جیپیں، واٹر ٹینکر اور کاروان۔ گیراج اور محل کے درمیان ہیلی پیڈ ہے جہاں پر دو ہیلی کاپٹر ہر وقت تیار کھڑے رہتے ہیں۔ محل سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر صحرا میں بنا ہوا ایئر سٹرپ ہے جہاں شیخ کا جہاز C130 یا جیٹ ایئر کرافٹ لینڈ کرتا تھا۔ چار انجنوں والا یہ پچاس سیٹر جیٹ خصوصی طور پر بنوایا گیا تھا۔ یہ اسٹارٹ ہو کر پانچ سو فٹ کے فاصلے پر جا کر اُڑ سکتا تھا۔ اسی طرح لینڈنگ کے وقت بھی اسے بہت تھوڑی جگہ درکار ہوتی ہے۔ رن وے سخت مٹی کا بنا ہوا تھا۔ صحرا میں جہاں ریت نہ ہو زمین سخت ہو اسے ڈار کہتے ہیں۔ اس میں سیمنٹ کی ایک چھٹانک تک نہیں لگائی جاتی۔ محل سے ملحقہ باہر مہمان خانہ ہے جو سردار شیخ کے ساتھ آتے ہیں انہیں وہاں ٹھہرایا جاتا ہے۔ اندر صرف شاہی خاندان ہی ٹھہر سکتا ہے۔ محل کا ایک حصہ خواتین کے لئے مختص ہے۔ جب شیخ کی چہیتی بیگم شیخہ فاطمہ آتی تھیں تو وہ کھلتا تھا۔ اس کے اندر جانے کی کسی کو اجازت نہیں۔ صرف خدمت گار عورتیں اندر جا سکتی ہیں۔ محل کے اندر ہر قسم کے پھول اُگے ہیں۔ جگہ جگہ روز گارڈن ہیں۔ کھانے کا بندوبست کراچی کی ایک کیٹرنگ فرم کرتی ہے۔ کیوی آر اور مچھلی کیپین سے منگوائی جاتی ہے۔ بیف آسٹریلیا سے آتا ہے۔ ٹیولپ ہالینڈ سے درآمد ہوتے ہیں۔ جب بھی شیخ زید یا شاہی خاندان کا کوئی فرد ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتا ہے تو چالیس کورسز کا ڈنر سرو کیا جاتا ہے۔ کوئی ایسا چرند پرند نہیں جس کا گوشت نہ پکتا ہو۔ منرل واٹر سوئٹزرلینڈ سے آتا ہے۔ فروٹ اور ڈرائی فروٹ پاکستان کے ہوتے ہیں۔ شیخ کو پاکستانی پھل بہت پسند ہیں۔ باغ کے آم اور کنو باقاعدگی کے ساتھ ابوظہبی بھجوائے جاتے ہیں۔

جیسے جیسے معلومات میں اضافہ ہوتا گیا حیرت کے کئی در وا ہوتے گئے۔ اس قدر مخیر حکمران شاید ہی کوئی اور ہو۔ شیخ نے تین بہت بڑے ہسپتال بنوائے ہیں۔ لاہور کے شیخ زید ہسپتال میں ہزاروں مریض شفایاب ہو رہے ہیں۔ اس طرح رحیم یار

خان میں ایک بہت بڑا ہسپتال بنوایا گیا ہے۔ میڈیکل ایکیو پمنٹ اس قدر جدید ہے کہ حکومت کو اسے استعمال کرنے کے لئے مناسب ٹیکنیشن نہیں مل رہے تھے۔ ہزہائی نس ہسپتال بنا کر حکومت کے حوالے کر دیتا ہے۔ تیسرا ہسپتال بلوچستان میں بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ غریب لوگوں کی رہائش کے لئے تین کالونیاں بنائی گئی ہیں جہاں ضرورت مندوں کو مفت رہائش کی سہولت میسر ہے۔ ہزاروں بیواؤں، یتیم بچوں اور قابل طالب علموں کو ماہانہ وظیفہ دیا جاتا ہے۔ ہزاروں لوگوں کو روزگار فراہم کیا گیا ہے۔ ان دنوں بھی پچاس کروڑ روپے کی خطیر رقم سے مختلف تعمیراتی منصوبے مکمل کیے جانے تھے۔ شیخ کا سب سے بڑا کارنامہ صحرا میں پانی کی فراہمی ہے۔ چولستانیوں کے لئے ڈیڑھ سو کلومیٹر لمبی پائپ لائنیں بچھائی گئی ہیں۔ جس سے انسان چھوڑ جانور بھی فیض یاب ہوتے ہیں۔ صحرا میں غضب کی گرمی پڑتی ہے۔ وہاں میٹھا پانی ایک ایسی نعمت ہے جس کا الفاظ احاطہ نہیں کر سکتے۔ شیخ نے دینی و دُنیاوی تعلیم کے لئے تین اسلامک سنٹر کراچی، لاہور اور پشاور میں قائم کیے۔ ہزہائی نس کو پختہ یقین ہے کہ تعلیم کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کے لئے اس کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ قرآن میں ہر مرد و زن کے لئے تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے اور یہ سلسلہ پیدائش سے لے کر دم واپسیں تک پھیلا ہوا ہے۔ تعلیم خود شناسی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ خود شناسی سے خدا شناسی آتی ہے اور جب ایک مرتبہ آدمی اپنے رب کو پالے تو پھر اسے ارضی خداؤں سے نجات مل جاتی ہے۔ ان اداروں کی ترقی اور ترویج کے لئے خطیر رقم مختص کی گئی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ رحیم یار خان اور چولستان کا مقبول ترین شخص کون ہے تو لامحالہ شیخ زید کا نام پردہ ذہن پر اُبھرے گا۔

سیکورٹی کے انتظامات سخت ہیں۔ اس میں مرکزی اور صوبائی حکومتیں حصہ لیتی ہیں۔ Outer Cardon کو رینجرز کنٹرول کرتے ہیں Inner Cardon پنجاب پولیس کی ذمہ داری ہے۔ خیمہ بستی میں شیخ کی اپنی سیکورٹی ہوتی ہے۔ C130 جہازوں میں ابوظہبی سے کمانڈو آتے ہیں۔ سوائے چند ایام کے شیخ محل میں نہیں رہتا۔ اپنی شکاری پارٹی کے ساتھ صحرا میں قیام کرتا ہے۔ قبائلی سردار اور شہزادگان تو خیموں میں رہتے ہیں لیکن شیخ اور کراؤن پرنس کے لئے Motarized Carawan ہوتا ہے۔ ایک بہت بڑی بس نما گاڑی جس میں زندگی کی ہر سہولت میسر ہوتی ہے۔ ڈرائنگ، ڈائننگ روم، سونے کا کمرہ، غسل خانہ، ٹی وی لاؤنج، فرج اور ایئر کنڈیشنر اور ساری دنیا سے Connected وائرلیس

سسٹم۔ صحرا میں شیخ گاڑی خود چلاتا ہے۔ کسی شوفر کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

شیخ زید بن سلطان سے پہلی ملاقات:

جنوری ۱۹۸۷ء کی ایک سہانی صبح تھی جب ہم صحرا میں کھڑے شیخ زید کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ آسمان صاف تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں جسم کو چھید نہیں بلکہ ٹکور کر رہی تھیں۔ نرم سکون آور دھوپ۔ اہل یورپ تو اس قسم کے موسم پر مر مٹتے ہیں۔ سارا شہر پارکوں، ساحلوں اور میدانوں میں نکل آتا ہے۔ Basking in the sun ایک ایسی لذت ہے جو اہل یورپ کو کبھی کبھی نصیب ہوتی ہے۔ استقبالیہ پارٹی میں میرے علاوہ انعام الرحمٰن سحری، سیٹھ اسلم اور میاں عبدالخالق تھے۔ میونسپل کمیٹی کے چیئرمین ہونے کے ناطے پھولوں کا ہار اسی کو پہنانا تھا۔ عین وقت پر لوہے کی چیل فضا میں نمودار ہوئی۔ ہر نگاہ آسمان کی طرف اُٹھ گئی۔ جہاز کی لینڈنگ بھی پائیلٹ کی مہارت کی آئینہ دار تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے گردوغبار کا چھوٹا سا طوفان اُٹھا جو جلد ہی ختم ہوگیا۔ سب سے پہلے شیخ زید کے مشیر ظفر اقبال اُترے۔ انہوں نے سیکورٹی کا جائزہ لیا اور جب ان کی تسلی ہوگئی کہ تمام انتظامات مکمل ہیں تو وہ جہاز کے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد شیخ زید بن سلطان النہیان صدر متحدہ عرب امارات و حکمران ابوظہبی جہاز کے دروازے پر نمودار ہوئے۔ فضا شیخ زندہ باد کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور حکومت پاکستان کی طرف سے خوش آمدید کہا۔ اس کے بعد میاں عبدالخالق نے گلاب کے پھولوں کا ہار پہنایا۔ جہاز سے لے کر گاڑی تک سو گز کا فاصلہ تھا۔ اس عرصے میں مجھے ان کی شخصیت کا جائزہ لینے کا موقعہ ملا۔ درمیانہ قد، گندمی رنگ، قدرے عقابی ناک، خشخشی داڑھی، آنکھوں میں بے پناہ چمک اور ذہانت کی جھلک، اڑسٹھ سال کے پیٹے میں۔ انگریزی کسی حد تک سمجھتے تھے لیکن بولتے نہیں تھے۔ ظفر اقبال مترجم کے فرائض ادا کر رہے تھے۔

رینج روور کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے ہمیں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ کافی سالوں سے یہ رسم چلی آرہی تھی کہ ڈپٹی کمشنر پہلے اور آخری دن کا کھانا شیخ زید کے ساتھ کھاتا تھا۔

جب ہم محل میں پہنچے تو شیخ زید قبائلی سرداروں اور شہزادگان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ ہر قسم کے میوہ جات اور انواع و اقسام کے پھل میزوں پر پڑے تھے۔ ڈرائنگ روم میں گئے تو انہوں نے ازراہ مہمان نوازی اُٹھ کر ہمارا استقبال کیا اور مجھے اپنے قریب بائیں طرف بٹھایا۔ ان کے دائیں جانب اُن کا داماد سرور بن محمد بیٹھا تھا۔ ملازم چھوٹے چھوٹے پیالوں میں قہوہ

(زعفرانی قہوہ) پیش کر رہے تھے۔ گھاوے کا پہلا گھونٹ بھرتے ہی طبیعت سیر ہوگئی۔ اس قدر مقوی زود اثر اور نیم کڑوا ڈرنک پہلے کبھی نہیں پیا تھا۔ اسے ہمارے زردالو پان کی Liquid version بھی کہا سکتا ہے۔ ویسے تو پیالے میں چند گھونٹ ہی ہوتے ہیں لیکن ہم ایک ایسی مصیبت میں گرفتار ہوگئے جو لاعلمی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب بھی ہم پیالی ختم کر کے خدمت گار کی طرف بڑھاتے وہ اسے از سر نو لبالب بھر دیتا۔ اُونچی آواز سے بس کر یار کہنا بھی بے ادبی کے زُمرے میں آتا تھا۔ پانچ سات کپ بمشکل حلق سے اُتار تو لئے لیکن غنودگی طاری ہونے لگی۔ مجھے گمان ہوا کہ سیٹھ اسلم نے اب ایک کپ بھی اور پی لیا تو وہ اٹل غفیل ہو جائے گا اور بھیگے ہوئے مرغ کی طرح اس کی گردن ایک طرف ڈھلک جائے گی۔ وہ تو بھلا ہو ظفر اقبال کا جس نے بالآخر ہماری حالت زار بھانپ لی۔ اس نے دھیمے پنجابی لہجے میں سمجھایا کہ جب تک خالی پیالہ سیدھے ہاتھ لوٹاتے رہو گے یہ بھرتا ہی جائے گا۔ اگر اور حاجت نہیں ہے کہ کپ لوٹاتے وقت اسے دائیں بائیں ڈگڈگی کی طرح گھماؤ۔ خدمت گار فوراً سمجھ جائے گا کہ تم لوگ پُر باش ہو چکے ہو۔ اصل صورت حال سے بے خبر قبائلی سردار ہمیں تعریفی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جس طرح ایک مے نوش دوسرے بلانوش کی کیفیت سمجھتا ہے انہوں نے بھی خیال کیا کہ ہم لوگ بڑے سخت جان ہیں کہ اس قدر زعفران اور معجونوں کو معدے میں اُتار کر بھی ہنوز قائم و دائم ہیں۔ پیلس منیجر خورشید نے جب آ کر کہا Your highness the lunch is served تو ہماری جان میں جان آئی۔

کھانے کی میز پر سو آدمیوں کا کھانا چنا گیا تھا۔ میز کے آخری سرے پر شیخ زید کی کرسی تھی۔ دائیں بائیں ہم لوگ بیٹھے تھے۔ چونکہ پہلا دن تھا اس لئے ساٹھ کورس کا کھانا تھا۔ سات قسم کے سوپ تھے۔ چکن کریم سوپ، ملگوٹنی، ہاٹ اینڈ ساور، کریب سوپ، چکن بادام، کلیئر سوپ اور مرغ کی یخنی، صرف مچھلی کی آٹھ قسمیں تھیں۔ ٹراوٹ، بکٹی، کے وی آر، رہو، جمبو پرانز دیکھ کر حیرت ہوئی۔ چھوٹی مچھلی کے سائز کے تھے۔ اس کے علاوہ Oysters اور لابسٹر بھی تھے۔ سالم روسٹ شدہ دنبے، تیتر، تلور، چکور، سی سی سینڈ گراوز، مرغابی ہرن، مرغ مسلم، ٹی بون اسٹیکس، چکن تندوری تکہ، سیخ کباب، بریانی اور سالن کی کئی قسمیں تھیں۔ سبزیوں میں بھنڈی، مٹر، کریلے گوشت، اور بینگن کا بھرتہ تیار کیا گیا تھا۔ دالوں میں ماش اور ارہر کی دال نمایاں تھی۔ اس قدر کثیر تعداد میں کھانے دیکھ کر ہی اشتہا بڑھ جاتی ہے۔ جب کھانا شروع ہوا تو حیرت میں مزید

اضافہ ہوتا گیا۔ شیخ زید طبعاً بہت آہستہ کھاتے تھے۔ جتنی دیر میں انہوں نے سوپ کا پیالہ ختم کیا، عرب سردار سالم دنبوں کے بچے اُدھیڑ چکے تھے۔ تکوروں اور تیتروں کی شامت آ گئی تھی۔ ماہی سیخ موج تک آئے بنا ہی کباب تھی۔ وہ کھانا کھا کر ایک ایک کر کے اُٹھتے گئے۔ کسی نے شیخ زید کے کھانا ختم کرنے کا انتظار نہ کیا۔ نہ انہوں نے کسی قسم کی ناراضی یا خفگی کا اظہار کیا۔ اب جبکہ سارے سردار جا چکے تھے اور ہم ہنوز سوپ کے ساتھ انصاف کر رہے تھے تو ہمیں ہز ہائی نس کے ساتھ کھل کر باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے شہر کے متعلق چند سوالات پوچھے اور پھر خود ہی کہنے لگے مجھے اس علاقے سے بڑا جذباتی لگاؤ ہے۔ میں پاکستان کو اپنا دوسرا وطن سمجھتا ہوں لیکن رحیم یار خان کو وطن کا حصہ گردانتا ہوں۔ مجھے شہر کے مسائل سے کافی حد تک آگاہی ہے لیکن ایک سال بعد آیا ہوں۔ اس لئے کوئی نیا منصوبہ شروع کرنا ہو تو بلا جھجک بتاؤ۔ عرض کیا ''آپ نے پہلے ہی اس علاقے کے لئے اتنے رفاہی کام کیے ہیں کہ خلق خدا آپ کو دعائیں دیتے نہیں تھکتی لیکن دو منصوبے آپ کی خصوصی شفقت چاہتے ہیں۔''

''وہ کیا ہیں؟'' انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔ رحیم یار خان میں شیخ زید انٹرنیشنل ایئرپورٹ اور ایک بہت بڑا پبلک سکول۔

''Done'' انہوں نے بغیر کسی توقف کے کہا۔ سکول کے متعلق صرف اتنا پوچھا کہ آپ لوگ کس قدر رقم کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہم اسی لاکھ روپے جمع کر چکے ہیں۔ بقیہ میں دوں گا۔ انہوں نے تسلی دی۔ تعمیراتی کام شروع کریں۔ کروڑوں روپے کا منصوبہ تھا۔ جہاندیدہ حکمران تھا۔ صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ہم منصوبے میں کس حد تک سنجیدہ ہیں۔

سوپ کے بعد مین کورس شروع ہو گیا۔ ہمیں عرب سرداروں کی طرح کوئی جلدی نہ تھی۔ ہم نے تو یہی سیکھا تھا کہ کھانا اس وقت تک کھاتے رہو جب تک مہمان خصوصی تناول فرماتا رہے۔ جب وہ ختم کرے تو فوراً ہاتھ کھینچ لو۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ یہاں مہمان اور میزبان بیک وقت ہز ہائی نس تھا۔ ہماری میزبانی صرف اس حد تک تھی کہ وہ ہمارے شہر میں مقیم تھا۔

جب سویٹ ڈش آئی تو شیخ نے ایک عجیب سوال پوچھ لیا۔ کہنے لگے ''تمہارے دریاؤں کا منبع کہاں ہے؟''

عرض کیا ''ہمالیہ اور کوہ سلیمان!''

''دریا کہاں جا کر گرتے ہیں؟'' ان کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

''بحیرۂ عرب میں!''

''اس طرح کتنا پانی ضائع ہوتا ہے؟''

''بہت زیادہ۔ بالخصوص برسات کے موسم

میں۔"

"My God" انہوں نے قدرے غصے سے ہماری طرف دیکھا۔

What a collosal wastage of this gift of God. Give me water & I will give you oil.

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے "اتنی قیمتی شے کی قدر کیوں نہیں کرتے۔ اگر میرے پاس اس قدر پانی ہوتا تو میں عرب کے صحراؤں کو مرغزاروں میں تبدیل کر دیتا۔ پانی نعمت خداوندی ہے۔ مستقبل کی تمام جنگیں اس کے حصول کے لئے ہوں گی۔" ایک فارسی کہاوت ہے۔ تا مرد سخن نہ گفتہ باشد، عیب و ہنرش نہفتہ باشد۔ ہم بڑی رغبت کے ساتھ حکمت کے موتی چن رہے تھے۔

جب ہم محل سے نکلے تو دن کے تین بج رہے تھے۔ میں شیخ زید کی تعریف میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیٹھ اسلم نے نوحہ خوانی شروع کر دی۔ کہنے لگا "خدا کی قدرت دیکھیں! ایک میں شیخ ہوں ایک یہ شیخ ہے۔ اس کے پاس پانچ سو گاڑیاں ہیں، میرے پاس چند ٹوٹی پھوٹی پجیرو ہیں۔ اس کے محل کے سو کمرے ہیں، میرے کوٹھی نما گھروندے میں صرف آٹھ بیڈ روم ہیں۔ ایک یہ شیخ ہے ایک میں شیخ ہوں۔ اس کے دسترخوان پر بیسیوں قسم کے کھانے پکتے ہیں، میری بیوی نے آلو گوشت اور شلجم گوشت کھلا کھلا کر ہلکان کر دیا ہے۔ یہ اپنے ہوائی جہازوں میں سفر کرتا ہے اور میرے کان ریل گاڑی کی کوکو سن کر کان پک گئے ہیں۔ یہ مئے ناب پیتا ہے اور میری بیگم جرعہ آب پر بھی شک کرتی ہے۔ ایک یہ شیخ ہے، ایک میں شیخ ہوں۔" بس کرو! میاں خالق نے اسے ڈانٹا۔ کفرانِ نعمت اسی کو کہتے ہیں۔ تقسیم سے قبل تمہاری کیا حالت تھی۔ ملیشیا کا پاجامہ اور ہوائی چپل پہنتے تھے۔ سواری کے لئے سائیکل بھی نہیں تھی۔ لالے تو کھاتے ہی دال ہیں، تم کون سا گوشت خور تھے۔ اب کیا نہیں ہے تمہارے پاس۔ کوکا کولا کی تین فیکٹریاں، کاٹن ملز، خانپور میں پچاس مربعہ زمین تم اپنا تقابل اہل ضلع سے کیوں نہیں کرتے۔ کہاں جا کر سینگ اڑائے ہیں۔ اس کے بعد سیٹھ اسلم ایک میں ہوں ایک وہ ہے والی گردان نہ کر سکا۔ لفظوں نے اس کے حلق کی سرنگ میں چند گرداب کھائے اور ڈوب گئے۔

شیخ زید انٹرنیشنل ایئرپورٹ: شیخ زید کے ڈائریکٹر ورکس نے جب ایئرپورٹ کے لئے انٹرنیشنل ٹنڈر کال کیے تو سول ایوی ایشن والوں نے روڑے اٹکانے کی کوشش کی۔ جب ان کے کان میں بھنک پڑی کہ ہز ہائی نس اپنے ذاتی خرچ پر بہت

بڑا ہوائی اڈہ بنوانا چاہتا ہے تو انہوں نے نقد رقم کی فرمائش کی۔ اس قدر کثیر رقم جب نہ ملی تو انہوں نے منفی پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں مجھے بھی کراچی سے ان کے سربراہ ایئر مارشل بخاری کا فون آیا۔ وہ گرج رہے تھے۔ ڈی سی صاحب آپ نے یہ کیا کیا ہے۔ شیخ کو بہلا پھسلا کر ہوائی اڈے کی حامی بھروالی ہے۔ ہندوستانی بارڈر سے اس قدر قریب ایئرپورٹ ''سیکورٹی ہیزرڈ'' ہے۔ آپ کو کچھ ملک و قوم کا بھی سوچنا چاہئے۔ کل کلاں اگر کچھ ہو گیا تو اس کی براہ راست ذمہ داری آپ پر عائد ہوگی۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک عسکری ادارے کا سابق ایئر مارشل بول رہا تھا۔ میں نے پوچھا ''لاہور سے واہگہ کتنا دور ہے؟''

''لاہور کی بات اور ہے؟'' وہ گرجا۔

''رحیم یار خان کا مقابلہ لاہور سے کیسے کیا جا سکتا ہے۔''

میں اس سے پہلے اسے کبھی نہیں ملا تھا۔ اس کا لب ولہجہ بڑا جارحانہ تھا۔ بات اس قدر اُونچی آواز میں کر رہا تھا کہ مجھے ڈر پیدا ہوا کہ کہیں ٹیلیفون کی تاریں جھنجھنا کر ٹوٹ ہی نہ جائیں۔ میں سمجھ گیا کہ اس پر کلام نرم و نازک بے اثر ثابت ہوگا۔ چنانچہ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے کا عزم کر لیا۔ ایئر مارشل! میری بات غور سے سنو! یہ ایک دیرینہ عوامی مطالبہ ہے جو ملک و قوم کے مفاد میں کیا گیا ہے۔ میں تمہارا مسئلہ سمجھتا ہوں۔ یہاں لوگوں میں بے پناہ اشتعال پایا جاتا ہے۔ تم اگر اپنا افسر بھیجو گے تو میں عوامی مفاد میں اسے ضلع بدر کر دوں گا۔ آپ لوگوں کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیارات کا تو علم ہی ہوگا۔

کچھ دنوں بعد اطلاع آئی منسٹری آف ڈیفنس نے فریقین کا موقف سننے کے لئے راولپنڈی میں میٹنگ تجویز کی ہے۔ میں جب پنڈی پہنچا تو کمرے میں ایئر فورس کے دو حاضر سروس ایئر وائس مارشل بھی موجود تھے۔ مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے ''ڈی سی صاحب آپ نے زبردست کام کیا ہے۔ جنگ کے دوران ہم اس ہوائی اڈے کو بطور فارورڈ ایئر بیس استعمال کریں گے۔ ہندوستان نے سارے بارڈر پر ہوائی اڈوں کا جال بچھا رکھا ہے۔''

کام شروع ہوا تو ٹھیکہ ایک سوئس فرم کے توسط سے چوہدری منیر کو ملا۔ جو منصوبہ ایک سال میں مکمل ہونا تھا اسے تکمیل میں تین سال لگے۔ سول ایوی ایشن والوں نے ہر قسم کے روڑے اٹکانے کی کوشش کی Earth work ہو رہا تھا۔ ہر چھ فٹ کے بعد چھ فٹ کا گڑھا کھود کر مٹی نکال کر Lab test کے لئے بھیج دیتے۔ ان کے فٹنس سرٹیفکیٹ کے بغیر کوئی جہاز لینڈ نہیں کر سکتا۔ چوہدری منیر بزنس مین تھا، کچھ کہہ سن کر صلح کر لی۔

[جاری ہے۔]

حضرت صاب

کرنے کے لیے جب کوئی بات نہ بچتی تو اُن میں سے کوئی ایک بول اٹھتا۔
''ہم چار ہی کیوں ہیں؟''
چاروں برسوں سے ایک ہی بستی میں رہ رہے تھے مگر ایک دوسرے سے متعارف ہوئے اُنھیں بمشکل چھے مہینے ہی گزرے تھے۔ اس سے پہلے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ضرور تھے مگر بغیر علیک سلیک اور بنا کوئی بات کیے آگے بڑھ جاتے۔ شہر دیکھتے ہی دیکھتے ایسے پھیل چکا تھا جیسے صدیوں پرانی سستی نکال رہا ہو۔ یہاں گھر لینے کے بعد جمال نے اپنے ہمسایے سے تعلق بڑھانے سوچا تو وہ بُرا سا مُنہ بنا کر کہنے لگا: ''صاحب' اِس ٹاؤن ہے کہ کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں کہ وہ بے کار میں دوسرے کے سوالوں کا جواب دے۔ یہ آج کا ٹاؤن ہے۔ یہاں لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں''.....
اُس کے رویے سے جمال اتنا اثر لیا کہ اُس کے بعد اُس نے کسی کا بھی مزاج پوچھنے کی جرأت نہیں کی۔ شاید باقی تینوں کے ساتھ بھی کوئی ایسا ہی حادثہ پیش آیا تھا۔ لوگ ایک دیکھتے ضرور تھے مگر کوئی کیے بغیر چپکے سے آگے نکل جاتے تھے۔
ٹاؤن والے دیر سے سوتے اور دیر سے جاگتے۔ صبح میں آنکھ کھلتے ہی سامنے والی دیوار پر ٹنگے کلاک کو گھور کر دیکھتے۔ ''اوہ'' کہ کر ہڑبڑا کر بستر سے یوں برآمد ہوتے جیسے بستر میں کرنٹ آ گیا ہو۔ پھر سیدھے واش روم جو کبھی غسل خانہ کہلاتا تھا کی طرف لپکتے۔ کوئی اندر ہوتا تو دروازہ کھٹکھٹاتے اور جملہ دہراتے..... ''ذرا جلدی۔ مجھے دفتر سے دیر ہو رہی ہے''۔ تیار ہو کر سڑک پر پہنچتے تو ٹریفک کی سست روی دیکھ کر حکومت کو دل ہی دل میں ایسی سناتے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

.....

اسلام عظمی

اخباروں میں جب ایک ٹھنڈے ملک سے ایک ایسے جرثومے کی خبریں آنے لگیں تو بھائی لوگ خوب ہنسے۔ جرثومہ کسی چھلاوے کی طرح تھا۔ کسی مریض کی چھوئی ہوئی چیز کو چھونے سے کلائی پکڑ لیتا تھا۔ کچھ روز تک تو لوگ یہی کہتے رہے کہ بات سے بتنگڑ بنانا تو کوئی میڈیا والوں سے سیکھے۔ جمال نے کئی برس پہلے "مرجانے کے بعد کیا ہوگا" قسم کی کتاب لکھی اور اُس میں بچھوؤں وغیرہ کا تذکرہ سینٹی میٹروں اور میٹروں میں کیا تو کسی نے تعجب سے پوچھا: "یار' ناپ اور ماپ کے جدید پیمانے اللہ کے اِس بندے نے کہاں سے لے لیے؟" جواب ملا: "یہ بہت بگڑی ہوئی قوم ہے۔ اسے ذرا ڈھنگ سے ڈرانا پڑتا ہے"۔

....

پھر اس خوف نے بستیوں تو کیا ملکوں کو ہی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لاک اَپ رواجی معنوں سے نکل کر اساطیری دور جیسا ہو گیا "وہ شہر میں داخل ہوا تو دیکھتا ہے کہ نہ تو وہاں بندہ ہے اور نہ ہی بندے کی ذات۔ بازاروں میں ہو کا عالم ہے۔ جب پوری دنیا اک سناٹے کی زد میں آ گئی تو گھروں میں بیٹھے لوگ ایسے اکتائے کہ کسی سے بات کرنے کو ترسنے لگے۔ یوں وہ چاروں ایک دوسرے سے از خود متعارف ہو گئے۔ ایک جیسے دکھنے کی وجہ سے اُنھوں نے ایک دوسرے کو اپنا ہم عمر جانا اور اکٹھے بیٹھنے لگے۔ ایک جیسا دکھنے کی وجہ یہ تھی کہ اپنے بالوں کو تسلسل کے ساتھ رنگتے تھے۔ اب ماسک پوشی کے بعد اُنھیں احساس ہوا کہ ماسک تو ایسی نعمت ہے کہ دوست دوست پہچان نہیں پاتا۔ چنانچہ بالوں کو رنگنے کا عمل سست پڑ گیا۔ وبا میں تیزی کے بعد سستی آئی تو ماسک پوشی میں بے احتیاطی دَر آئی۔ تبھی اُنھیں احساس ہوا کہ وہ چاروں مبالغے کی حد تک ہم شکل ہیں...... ایسے ہم شکل تھے کہ ہوشیار بندہ بھی چکرا جائے۔ عمروں فرق نہ ہوتا تو دیکھنے والا 'کون کون ہے' کے چکر میں پڑا رہتا۔ کبھی فلموں میں دو ہم شکلوں کہانی لکھوائی جاتی تھی۔ ایک ہی بندہ دو قسم کے کردار نبھاتا۔ سیاست دانوں کی طرح سے ایک اچھا کردار اور ایک بُرا کردار۔ دوسروں کے بال رنگنا چھوڑا تو جمال نے بھی اپنی وگ اتار پھینکی۔ تینوں میں سے کسی ایک نے اس پر "فارغ البال" کی پھبتی کسی۔ وہ عمر میں چھوٹا تھا اور بال عموماً ادھیڑ عمر میں جھڑنا شروع کرتے ہیں۔

جمال نمازی بندہ تھا۔ دفتر سے آنے کے بعد گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر کے علاوہ اُسے کوئی کام نہ تھا۔ بار بار چائے پینا اس کا معمول تھا۔ دوستی کے بعد چاروں جمال کے گھر میں جمع ہونے لگے۔ چائے کے بعد کبھی کبھار کھانے کا پروگرام بھی بن جاتا۔ جو میسر ہوتا بے تکلفی سے کھا لیتے۔ ایک روز

دال کھا کر جمال نے شکر گزاری کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور پھر بآواز بلند الحمدللہ کہا تو تینوں اس کے پیچھے پڑ گئے: ''حضرت جی ..... دال کھا کر شکر گزاری! ایسے تو ہم مارے جائیں گے۔ اللہ میاں ایک بار پھر شاید مسور کی بارش کر دے''۔

یہ جملہ ازراہِ تفنن بولا گیا تھا مگر جمال پر لفظ ''حضرت'' فٹ ہو گیا۔ تینوں جمال کو ''حضرت صاب'' کہہ کر پکارنے لگے۔ جمال نے بھی اس بات کا بُرا نہ منایا کہ وہ ہر کسی کو ''یا حضرت'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ ''یا حضرت'' جمال کا تکیۂ کلام تھا۔ نوعمری میں جمال کے ایک دوست کی پرانی کتابوں کی دکان تھی۔ دوست کو جب کسی کام سے کہیں جانا پڑ جاتا تو وہ اُسے دکان پر بٹھا کر چلا جاتا۔ گاہک اُن دنوں بھی کم ہوتے تھے۔ وقت گزاری کے لیے جمال کوئی بھی کتاب کھول لیتا۔ یادداشت اچھی ہونے کی وجہ سے چیدہ چیدہ اُسے ایسی یاد ہو جاتیں کہ موقعہ ملتے ہی وہ مخاطب کے مُنہ پر ٹھاہ کر کے مار دیتا۔ چونکہ وہ اپنی علمیت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا اس لیے بھی حضرت صاب کا خطاب اس پر درست بیٹھتا تھا۔

.....

زیادہ جان کاری نے جمال کو ضدی بنا دیا تھا۔ ماننے والی بات کو بھی نہ ماننا اُن کی عادت بن گئی تھی۔ ایک ہی بات بار بار کرنے اور کسی کی نہ سننے کی اُس کی عادت ایسی راسخ تھی کہ پیٹھ پیچھے تینوں کہتے کہ حضرت صاب کی سماعت خراب ہے یا پھر نیت۔ وہ گھنٹوں تک اکٹھے بیٹھے رہتے۔ ہاتھ لگ جانے والے کسی بھی موضوع کے حوالے سے لاحاصل گفتگو کرتے رہتے کیونکہ گفتگو تو وقت گزاری کا ایک بہانہ تھی۔ بات کرنے یا بڑھانے کے لیے کبھی کبھار کوئی موضوع دستیاب نہ آتا تو اُن میں سے کوئی بول ایک اُٹھتا ''ہم چار ہی کیوں ہیں؟'' کوئی نہ سوچتا کہ جب وہ خود کسی اور کو اپنی ٹولی میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تو چار سے پانچ کیسے ہوں گے۔ طویل خاموشی کے بعد حضرت صاب تینوں کے تھوبڑوں کو دیکھتے اور کہتے:

''مایوسی گناہ ہے بھائیو۔ انہونی کبھی بھی ہو سکتی ہے''۔

انہونی کا ہونا نئی بات نہ تھی۔ غیر متوقع حادثے نوعِ انسان کے ساتھ ہوتے رہے تھے۔ مگر ایسی اَن ہونی پہلی بار ہوئی تھی کہ کسی آفت نے ساری کی ساری نوعِ انسانی کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ہر فرد بلاتخصیص رنگ و نسل اور مذہب و ملت ایک ہی وبا کا شکار تھا۔ گلیوں اور بازاروں میں جیسے کوئی جن پھر گیا تھا۔

.....

''حضرت صاب، یہ کیا ہو رہا ہے''..... کوئی پوچھتا۔

''ایسا ہی ہوتا آیا ہے''..... حضرت صاب

جواب دیتے۔

"مگر کیوں؟"

"مگر کیوں" کے جواب میں انھیں ایک کہانی یاد آگئی۔ کہانی یوں تھی کہ ایک بستی کے باہر شام کو ایک بلا آکر ڈکراتی۔ بستی والے سمجھ جاتے کہ اُسے بھوک لگی ہے۔ وہ خوفزدہ ہو کر کوئی کمزور سا بندہ اُس کی طرف سرکا دیتے۔ بلا اُسے ہڑپ کر کے چلی جاتی اور یوں وہ لوگ اگلی شام تک محفوظ ہو جاتے۔ ظاہر تھا کہ یہ داستان فرضی تھی اور ٹائم پاس کے لیے گھڑی گئی تھی۔ سوال مگر ہر دن کے ساتھ اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ایک جرثومے نے روزمرہ کے سارے کام بگاڑ دیا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے ملنے سے کترانے لگے تھے۔ مگر وہ کہتے ہیں نا کہ اگر بُرا ہوتا ہے تو کچھ اچھا ہوتا ہے۔ اسی وبا کے سبب وہ ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے تھے۔ وبا سے پہلے ایک ہی بستی میں رہنے کے باوجود وہ ایک دوسرے کا نام بھی نہیں جانتے تھے اور اب اُن کی شامیں اکٹھی گزرنے لگی تھیں۔ تینوں حضرت صاحب کے ہاں جمع ہو جاتے۔ چائے کا دور چلتا رہتا۔ چائے ایسا مشروب ہے کہ ایک پیالی سامنے رکھ کر گھنٹوں باتیں کی جا سکتی ہیں۔ یہاں تو خیر سے چائے بھی افراط سے تھی اور باتونی بھی چاروں تھے۔ کسی کی بات میں وقفہ آتا تو جھٹ سے کوئی بھی باری اچک لیتا اور بات بڑھانا شروع کر دیتا۔ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی کہ بحث مباحثے کا سرپیر طے کرنا دشوار ہو جاتا۔ یہ بھی یاد نہ آتا کہ بات شروع ہی کیوں ہوئی تھی۔ ایک دوسرے کی دلجوئی کی خاطر وہ ایک دوسرے کی بے سروپا باتوں پر بھی سر دھنتے رہتے۔ رات بھیگنے لگتی اور گلی سے چوکیدار کی "جاگتے رہو" کی صدا سنائی پڑتی تو کوئی ہنس دیتا۔

"پاگل ہے۔ نیند کی گولی کھا کر سوئے ہوؤں کو جگاتا ہے"۔

"بے چارے کو تنخواہ اسی بات کی ملتی ہے کہ وہ آوازہ لگاتا رہے"۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تنخواہ حاصل کرنے کے لیے کام بھی کرنا کوئی ضروری تھوڑی ہے۔ دفتروں کے دفتر ایسے لوگوں سے بھرے ہیں۔ آوازہ نہ لگائے تو اُسے تنخواہ نہ ملے۔ تنخواہ نہ ملے تو بے چارہ بھوکا مر جائے"۔

چوکیدار کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اس تسلسل سے "جاگتے رہو" کا آوازہ دہراتا آیا تھا کہ اُسے دن رات کی پہچان بھول گئی تھی۔ مہینے کے مہینے وہ تنخواہ اکٹھی کرنے کے لیے دن میں نمودار ہوتا تو بچے اُسے دیکھ کر ڈر سے جاتے کہ اُس کا حلیہ ہی ایسا تھا۔ مگر وہی حلیہ چوروں کا خوفزدہ نہیں کرتا تھا۔ خیر چوکیدار کا آوازہ انھیں محفل برخاست کرنے پر مجبور کر دیتا۔ چلتی کہانی رک جاتی۔

....

باتیں اور کہانیاں ایک طرح سے تاریخ کا

تسلسل ہیں۔ فیثا غورث سے منسوب ہے کہ کسی گداگر سے ریزگاری نہ لو..... بات میں حکمت تھی۔ ہر کوئی حکیم نہیں ہوتا۔ حکمت کا دور نہیں رہا تھا۔ ہر درد کی گولی دستیاب تھی۔ روزمرہ سے یہ بات لیڈروں نے بھی سیکھ لی تھی۔ ہر مرض کا علاج اُن کے پاس تھا۔ عوام الناس کو فوائد سمجھانے کے لیے ترجمان بھی وافر مقدار میں دستیاب تھے۔ پھر ڈرکا ہے کا! ایسا کیوں کیسے اور کیوں ہوا؟ .....افراتفری اور ماری ماری کے اس زمانے میں اِس بارے سوچنے کی فرصت اور ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

''حضرت صاب' یہ ہو کیا رہا ہے؟''

اب حضرت صاب کیا بتاتے۔ ''اُونٹ رے اونٹ' تیری کون سی کل سیدھی'' والا محاورہ متروک ہو چکا۔ اب اُونٹ قربانی کی عید پر ہی مالدار لوگوں کو وافر مقدار میں نظر آتے تھے۔ حضرت صاب کا جی چاہتا کہ وہ اس مسئلے پر روشنی ڈالیں۔ وہ بتانا چاہتے کہ یہ غلط برآمد اور غلط درآمد کا شاخسانہ ہے مگر یہ سوچ کر چپ رہتے کہ پھر اُنھیں لفظ ''شاخسانہ'' پر بھی روشنی ڈالنی پڑے گی۔ اُنھوں نے کہیں پڑھا تھا کہ سوال کرنے اور جواب دینے والے کا ذہنی لیول ایک ہی ہونا چاہیے''۔

''لیول کیا!''

.....

برسوں پہلے حضرت صاب اپنے دفتر جاتے ہوئے ایک روز یہ سڑک سے گزرا کرتا تھے۔ سڑک کے دونوں طرف کھیت تھے۔ سال میں دو تین بار فصل بدلتی۔ کٹائی اور بوائی کے وقت وہاں میلہ سا لگا رہتا۔ زندگی عملی طور پر بھی محسوس ہوتی۔ ہل چلاتے کسان بھلے لگتے۔ اُن کے لیے کھانا لانے والی عورتیں اچھی لگتے۔ خوشیاں موسموں کے ساتھ ساتھ سفر کرتی رہتیں۔ پھر پتا نہیں کہ خوشیوں کو کوئی نظر لگ گئی۔ اچانک کیش کراپ (Cash Crop) کا شور اُٹھا اور بیلوں کی جوڑی کی جگہ ٹریکٹر آن کھڑا ہوا۔ یہ نظارہ بھی بہت دن نہیں رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سبز کھیتوں میں زردی اُگنے لگی۔ حضرت صاب نے کسی سے پوچھا کہ زردیاں کیوں اُگنے لگی ہیں!

''پانی کی مشکل ہے۔ دشمن نے پانی روک لیا ہے''۔

''دشمن کون؟''.....وہ عجب سی ہنسی ہنسا۔ بارش نہ ہو تو گھاس بھی سوکھنے لگتی۔ ایک روز جمال نے دیکھا کہ بنجر کھیت میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ کچھ دنوں پر وہاں بہت سے ہلچل شروع ہو گئی۔ جمال روز کئی لوگوں کو بنجر کھیتوں کے درمیان کھڑے ہو کر باتیں کرتا دیکھتا مگر درمیان میں دوری کی وجہ سے کچھ سن نہ پاتا۔ ایک روز وہاں پر اینٹوں کے سو ستون کھڑے کر دیے گئے اور پھر ان پر ایک بڑا سا بورڈ۔ یہ کسی ہاؤسنگ سوسائٹی کا بورڈ بورڈ تھا۔ ایک ستون کے ساتھ میز کرسی

رکھ کر ایک شخص بیٹھنے لگا۔ جمال دیکھتا کہ صبح سویرے دو بندے پیلی ٹانگوں اور چوکور ڈبے والی ایک مشین اُٹھائے وہاں گھومنے لگتے ہیں۔ اُن کے آگے والا بندہ جو شاید اُن کا انچارج تھا' کسی جگہ پر رُک کے پیچھے والے کو ٹھہرنے کا اشارہ کرتا تو وہ پھرتی سے مشین کی ٹانگیں پھیلا کر اُسے زمین پر گاڑ دیتے۔ انچارج مشین کے سر کو گھمانے لگتا۔ جمال کو وہ دوربین جیسی کوئی شے لگتی۔ مشین ایک آنکھ والی تھی۔ اسے یاد آتا کہ دجال کی آنکھ ایک ہوگی مگر ماتھے پر۔ مشین اٹھانے والے اسے سیٹ کر کے پیچھے ہٹ جاتے۔ اپنی آنکھ پرے ہٹا کر ایک کاپی کھول کر کچھ درج کرتا ہے۔ دفتر سے واپسی پر ہاؤسنگ سوسائٹی اس کے بائیں جانب ہو جاتی تھی۔ ایک روز اس کا لیول والے سے ٹاکرا ہو گیا۔

"تم لوگ یہ کیا لیے پھرتے ہو اور اس سے کیا کرتے ہو!"

"یہ لیول ہے اور ہم ٹیڑھے لوگوں کے لیے عالی شان عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔"

وہ یہ کہہ کر چلا ہوا مگر حضرت صاب سوچ میں پڑ گئے۔

....

کئی ہفتوں سے وہ چاروں اکٹھے بیٹھ رہے تھے۔ اچانک تینوں میں سے کسی نے کہا:

"حضرت صاب' ایسا کب تک چلے گا؟"

"کیا خبر؟" ......جواب دینے کے بعد حضرت صاب کو ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا قصہ یاد آ گیا۔ جنات کو کام پر لگا کر وہ اپنی لاٹھی تھام کر نگرانی کرنے لگتے۔ کھڑے کھڑے ایک روز اُن کا آخری وقت آ گیا مگر وہ لاٹھی کے سہارے ٹکے رہے۔ جنات اُن کے ڈر سے کام کرتے رہے حتیٰ کہ ایک روز اُن کی لاٹھی دیمک کے چاٹنے کے سبب ٹوٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی جنات پر یہ راز افشا ہوا کہ حضرتِ سلیمان نہیں رہے۔ مگر تب تک ہیکل کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔ سوچتے سوچتے حضرت صاب نے اُوپر کی طرف دیکھا۔ کافی دیر تک چھت کو تکتے رہے۔ پھر فرش پر نظریں جما دیں جیسے کچھ دیکھ رہے ہوں۔ پھر بڑبڑائے "ربا یہ کیا ہو رہا ہے!"......اتنا کہہ کر حضرت صاب نے سر جھکا لیا۔ دورانِ تفکر دیر تک سر جھکائے رکھنا حضرت صاب کی ادا تھی اور وہ مراقبے کے بعد تبسم کرتے تھے۔ ایسے میں اُن کا بولا ہوا جملہ لاجواب ہوتا۔ مراقبہ کچھ زیادہ ہی لمبا کھنچ گیا تو تینوں میں سے ایک نے انھیں بآوازِ بلند یاددہانی کروائی:

"حضرت صاب' سر اٹھائیے ...... چوکیدار دوسری بار بھی آواز لگا کر جا چکا ہے۔ پھر ہمیں اپنے اپنے گھر بھی جانا ہے"......اپنی بات کا جواب نہ پا کر اُس نے حضرت صاب کے شانوں کو ہلایا اور اس کے ساتھ حضرت صاب کا سر ڈھلک کر اُن کے شانوں پر آ گرا۔

☆☆☆☆☆

رات

اِس طرف کمرا خاموش ہے۔
شام کا پردہ گرتا ہے اور وہ دھڑام سے بستر پر آ گرتا ہے۔
غیر ارادی طور پر ہی اس کا بایاں ہاتھ تپائی کی طرف بڑھتا ہے اور ٹیبل لیمپ روشن کر دیتا ہے۔ زیرو واٹ بلب کا زردی مائل اجالا گویا منہ چڑانے لگتا ہے تپائی پر اوندھی کتاب کا یا شاید اُس میں قیدرات کا۔ جانے کیا سوچ کر وہ کتاب اٹھا لیتا ہے اور جانے کیوں وہی صفحہ کُھلتا ہے جس پر سرے سے صفحہ نمبر ہی درج نہیں۔ پڑوسی ورق پر دو سو اکیس لکھا دیکھ کر اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی نظریں صفحہ نمبر دو سو بیس سے دو چار ہیں۔ نگاہ اب تحریر کے عنوان سے متعارف ہوتی ہے:
آبی رنگوں سے بنا ایک فن پارہ: فرانس کے سیاہ فام تارکینِ وطن کے لیے نیو رومن بولڈ، سولہ پوائنٹ، اٹیلیسائزڈ عنوان سے ذرا نیچے شاعر، ایریل بلیک میں ملبوس، جارج ایلیٹ کلارک۔ اور پھر نگاہ دھیرے دھیرے سطروں کی ڈور سے الجھنے لگتی ہے:
کیلنڈر تمہارے نزدیک کیا ہیں؟
اور اینٹس؟
وقت بی آر ای ٹی جی این ای وہ لفظ کے ہجے کرتا ہے میں سہانی جاز دھن کا نام ہے
تم گہرے پردوں میں
قوسِ قزح سے اُوپر کہیں---
جہاں تم دھات سے بنے انسان ہو جنھیں دل درکار ہیں
ایسے دلیر انسان ہو جو ہمت کے طلب گار ہیں
کھیتوں میں کھڑے ایسے عجوبے ہو جنھیں ایسے ذہنوں کی ضرورت ہے جو ان کے اپنے ہوں
---جغرافیہ نام ہے پیرس کی بھوری بھوری لڑکیوں کا
موسمِ گل میں بے تاب سین کے پہلو میں۔
جرمن میں اس دریا کو شاید زائنے کہہ کر مخاطب کیا جائے
---خون بہتا ہوا---
تن تنہا، بہادر، کرائے کے بوسیدہ کمرے
افریقی نو آبادیاں
جازفین بیکر، تمہارے بھومپو والے گراموفون پر
کچوکے لگاتی ہوئی وائین
تمہیں چھوڑ دیتی ہے بے یار و مددگار

حامد یزدانی

متروک گاڑیوں کی طرح
یو۔ایس۔اے کی کسی تنہا، اداس جھونپڑ پٹی میں
سرحدیں تمہارے نزدیک کیا ہیں؟
اصلی سیون لیگ سینڈل پہنے
تم مونے کے نیلوفر کو روندتی چلی جاتی ہو۔۔۔

وہ چلی جاتی کیوں لکھتا ہے؟ چلے جاتے کیوں نہیں؟ اردو غزل کی دین، کیا ذہنی تربیت ہے! پھر ذہن لمحہ بھر کو فرار ہو جاتا ہے کہیں اُدھر، اس پار، وقت کے اس پار یا زندگی کے اس پار۔ اُس پار ہے کیا؟ کچھ صاف سجھائی نہیں دیتا۔

فن کار مونے سے اس کا تعارف بھی ایک فنکار دوست نے ہی کروایا تھا۔ ویو کارڈ پر چھپی امپریشنسٹ مونے کی آئل پینٹنگ ''سن سیٹ'' دکھا کر۔ تاثر پسند فرانسیسی فنکار! کچھ ایسا ہی کہا تھا دوست نے۔

ذہن بھی عجیب چیز ہے۔ ایک لمحے کے پتہ نہیں کتنے ہزارویں حصے میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ کہاں سن ۲۰۱۹ اور کینیڈا کا شہر ہیملٹن اور کہاں سن ۱۹۸۹ اور جرمنی کا شہر ڈوسل ڈورف؛ صوبہ رائن لینڈ ویسٹ فیلیا کا دارالحکومت اور اس کی کیوننگ آلے۔۔۔ شاہی سڑک، کچھ ایسا ہی مطلب بنے گا اس کا غالباً۔

ڈوسل ڈورف تو وہ اپنے ایک فنکار دوست علی کے ساتھ سوئٹزر لینڈ کا ویزہ لینے گیا تھا مگر زیادہ وقت بس ادھر اُدھر شہر گردی کی نذر ہوا۔ وہیں ایک سووینئر شاپ میں دیکھا تھا اس نے مونے کی پینٹنگ والا ویو کارڈ اور اس کے دوست نے بتایا تھا اس عظیم فن کار کی فنی خوبیوں کے بارے میں۔ کیا بتایا تھا؟ کچھ یاد نہیں۔۔۔ ''سن فلاورز'' والا کارڈ بھی تھا وہاں۔ مگر وہ تو وین گوخ کی پینٹنگ ہے ناں؟ ہاں، وہ اس نے ایمسٹرڈیم میں دیکھی تھی وین گوخ میوزیم میں۔ کہتے ہیں اب وہ کچھ دوسری پینٹنگز کی طرح دنیا بھر میں آوارہ گردی نہ کر سکے گی۔ بوڑھی اور کمزور ہو گئی ہے ناں۔ کیا فن بھی ریٹائر ہو سکتا ہے؟۔۔۔ نہ جانے اور کتنے فن پارے ہوں گے کہ اب بھی گھوم پھر رہے ہوں گے۔ سیلانی فن پارے!

جانے اسے ''سن سیٹ'' اور ''سن فلاورز'' کیسے یاد رہ گئیں حالانکہ کتنا کچھ ہے جو اب یادوں کی چوبی تختی سے دُھلتا جاتا ہے، کوٹ عبداللہ شاہ پرائمری سکول کے بچے کے کچی سیاہی سے لکھے حروف تہجی کی طرح۔۔۔ گاچی کے ساتھ ساتھ۔۔۔ کیا یہ بھی سرجری کی عطا ہے؟ مگر ڈاکٹر تو کہتے تھے کہ لوکل انستھیزیا کے اثرات چند ماہ میں زائل ہو جاتے ہیں۔۔۔ مگر یہاں تو مدت ہونے کو آئی اور دھند ہے کہ چھٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔۔۔ کیا یہ واقعی انستھیزیا ہی کا شاخسانہ ہے یا پھر سانسوں کی میراتھن جیتنے میں کوشاں عمر کا واویلا۔۔۔ جو وقت کی جیت میں زندگی کی ہار پانے کو اتنے باؤلی ہوئی جاتی ہے! وہ محسوس کرتا ہے کہ غزل تو کجا وہ نثر میں بھی کوئی ڈھنگ کی ایک سطر نہیں لکھ پایا۔ اسے خود پر ترس آنے لگتا

ہے۔ خود ترسیدگی! اگر ایسا کچھ ہوتا ہے تو--- وہ سوچتا ہے--- وقت جانے کب کا، کس گھاٹ لگ چکا!--- کچھ سراغ نہیں ملتا۔

وقت ندیم کی سطریں ---

اپنے پسندیدہ شاعر کے انتقال کی خبر سن کر اسے ادھورا سا مصرع سوجھا تھا--- اور بس۔ ذہن تھا کہ نظم کی راہ سے اتر کر سوالوں کی کسی اور ہی پگڈنڈی پر ہو لیا تھا۔ جواب! جواب نہ جانے کس جنگل میں گم تھے! ہاں، شجر شجر ایک دورویہ اداس سی پینٹنگ بنتی جا رہی تھی، رنگ آبی تھے یا روغنی؟ اسے یاد نہیں:

خواہشیں کیا ہیں؟
رات کی اونگھتی لہروں میں
نیو کیمپس کے گھاٹ پہ
سا تھ سن اور نگار فشگل کی دھن
مضطرب پانیوں پہ لہکتا گھٹ
بوڑھے گراموفون پہ
نارنجی پھولوں کے سائے میں!؟ ---

رات میں، سائے میں--- کچھ عجیب سا ہے۔ ہے ناں؟--- بات بنتی نہیں--- کچھ اور--- کیوں؟ کیا رات میں سائے نہیں ہوتے؟ وہ سوچتا ہے یا شاید پوچھتا ہے--- مگر کس سے؟--- ہاں، سائے کا تصور شاید دھوپ کی ضد میں زیادہ اجاگر ہوتا ہے--- اردو شاعری کی ذہنی تربیت پھر سے اس کی رہنمائی کا رضاکارانہ فریضہ انجام دینے آ دھمکتی ہے۔

--- تو سایہ دن میں ہونا چاہیے!

نہیں، نہیں دن میں سائے نہیں ہوتے بس پرچھائیاں ہوتی ہیں۔ پرچھائیاں--- ساحر کا دیوان، ساحر کا مکان! کمال ہے بھئی یہ ذہن بھی اچھلا تھا خواہش کے ساحل سے اور آن پہنچا پرچھائیوں کے دیس۔

ہاں تو کیا تھا وہ؟--- کیمپس گھاٹ--- رات--- سا تھ سن--- اور---

ہاں، ہاں--- وہ--- کچھ

پیا تے فوٹوگرام پہ
نیو کیمپس گھاٹ پہ
ہمیں تن تنہا، اداس--- سائیکل کا خیال تک نہ آئے
نارنجی پھولوں کے سائے میں
جو ورشت سے ٹھیک لگا کے آنے والے سفر کا سوچ رہی ہے
کیا واہیات ہے! یہ نہیں تھا۔
سفر کیا ہے؟ ہاں، سفر کیا ہے
--- سوچ آگے بڑھتی ہے
کالج کی ڈھلوانی راہداریوں سے
گنے کی ریڑھی تک
نمک، برف، کڑوا اور مٹھاس کی آمیزش!
آغاز تعطیلات سے ایک دن پہلے
ایک طویل پُرلطف نشست
پیسے کون ادا کرے گا؟ یہ طے نہیں۔
کافی ہاؤس سے کم کم ریستوران تک کی سیر؟
وہ برجیس صاحب ہیں: ایک سرگوشی
کون برجیس صاحب؟ کہاں؟
سینئر صحافی ہیں۔ تمہارے پیچھے والے میز پہ۔ جڑواں سوال۔ جڑواں جواب۔

کینیڈا، جرمنی، لاہور، نیو کیمپس، کالج ---
ارے نہیں صاحب، ایسی بھی بات نہیں۔
ایک ترتیب ہے ضرور خیال کی اس بے ترتیب رو میں بھی --- اور میں نے یہ ترتیب پا لی ہے --- یوریکا --- یوریکا --- !
ذہن کا سفر گویا معکوس انداز میں ہو رہا ہے۔
حال سے ماضی کی طرف۔ اُلٹا سفر بھی اُلٹا۔
تو اس حساب سے اب اسے سکول جانا چاہیے۔
مزنگ کے ننھے منے، کل چھ کمروں پر مشتمل، حال ہی میں تو میاں گئے ہائی سکول کی طرف جو ایک دور میں اسے پوری کائنات محسوس ہوتا تھا۔ اور اب پوری کائنات اسے --- !

جس داستاں کا مرکزی نقطہ ہے کائنات
اس داستاں کا ثانوی کردار میں بھی ہوں

اسے یاد آیا، یہ شعر سن کر ایک نقاد دوست نے برسوں پہلے اس کی کم فہمی کا خوب سراغ لگایا تھا کہ داستاں کا مرکزی نقطہ کائنات نہیں بلکہ انسان ہے اور یہ کہ جب اسے یہ راز سمجھ آ جائے گا تب --- تب --- تب پتہ نہیں کیا ہو جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔
تو اب کیا؟ چلئے صاحب، سمجھ آ گیا ہے مجھے یہ راز --- یہ عقدہ کشائی بھی ہو چکی ---
یوریکا --- یوریکا --- تو اب کیا؟ وہ سوچتا ہے۔
اب کیا؟ کچھ بھی نہیں ---
خط لکھ رہے ہو کیا؟ کوئی نہیں پوچھتا۔
نہیں، نہیں --- بس یونہی --- ایک تحریر سی --- یادیں --- شاید افسانہ --- پھر بھی وہ جواب دیتا ہے۔

میاں، بہتر ہے افسانہ نگاری کا کام تم افسانہ نگاروں پہ چھوڑ دو، یہ کتاب پڑھو اور سو جاؤ۔ دو بجیں --- نہیں، نہیں دو اکیس ہو گئے ہیں۔ صبح دفتر بھی تو جانا ہے۔ سو جاؤ۔
مگر سوؤں کیسے؟ سونے کے لیے اندھیرا چاہیے۔
تو ٹیبل لیمپ بجھا دو ناں۔
ٹیبل لیمپ؟ ٹیبل لیمپ بجھا دیا تو رات سو جائے گی --- اور رات سو گئی تو --- !

تو --- اُس طرف ---
اونگھتی لہروں میں
--- خون بہتا ہوا ---
نیو کیمپس کی گلی پہ
--- کرائے کے بوسیدہ کمرے
سائنس اور نگار فرسٹل کی دھن
تمہارے بھوسپوا لے گراموفون پہ
ایکسٹرو م --- لاہور --- گوسل وورف
موٹے --- سن سیٹ
نارنجی پھولوں کے سائے
مت روک گاڑیوں کی طرف ---

کتاب خوابیدہ ہاتھ سے لڑھک کر فرش پر اوندھی پڑی ہے۔ رات اب آزاد ہے۔ وہ سرسراتے ہوئے پھسل جاتی ہے اُس طرف ادھ کھلی کھڑکی سے اُس پار۔ اب اسے بے سمت گردی سے کوئی نہیں روک سکتا۔ سیلانی رات!

کمرا خاموش ہے
رات مفرور
ٹیبل لیمپ مگر جل رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

سٹار گرل

''میں نے ہمیشہ تمھارے لیے فطانت اور کامیابی کی دعا مانگی۔ افشاں نے اپنی بیٹی سجل آغا کا ماتھا چوما جس کے ہاتھ میں امتحان میں پہلی پوزیشن پانے کا انعام تھا۔

''یہ میری محنت ہے ممّی''

''آف کورس بیٹا''

''تو آپ اپنی دعا کا کریڈٹ نہ لیں'' ممّی نے اُسے ''بولڈ'' اور ''کانفیڈنٹ'' بنایا تھا۔ رُک کر اسے دیکھا کچھ کہنا چاہا مگر مسکرا کر چپ ہوگئی۔

مغرب کی نماز سے فارغ ہوکر ممّی سجل کے کمرے میں جھانکی۔ وہ لیپ ٹاپ پہ جھکی ٹائپ کررہی تھی۔

''جوس پیوگی؟'' اُس نے انکار میں سرہلا دیا۔

''ڈنر میں دال چاول بنالوں'' نازوں پلی اکلوتی بیٹی کی پسند کو مدّنظر رکھ کر کھانا بنتا تھا۔

''ممّی ڈسٹرب نہ کریں۔ آپ جائیں۔ میں ڈاٹا Collect کررہی ہوں۔''

افشاں کو اچھا نہ لگا۔ چھوٹا سا جواب تو دے سکتی تھی ''ہاں یا نہیں'' وہ تو سوچ کر گئی تھی کہ نماز کی تلقین کرے گی مگر ہمت نہ پڑی۔

سجل بلاشبہ ذہین اور لائق لڑکی تھی اوّل جماعت سے لگاتار فرسٹ آرہی تھی اور اب دہم درجہ میں تھی۔ اساتذہ کی آنکھ کا تارہ تھی۔ افشاں جب بھی سکول جاتی بیٹی کی تعریفیں سُن کر پھولے نہ سماتی۔ ہر سال ''سٹار گرل'' کا اعزاز اُس کا ہوتا تھا۔

انعام، شاباش اور تعریف کی اُس کو عادت ہوگئی تھی۔ تعریف سنتی تو یوں منہ بناتی جیسے سُن سُن کے تھک گئی ہو۔ نہ سنتی تو اگلے کو جاہل گردانتی۔ رفتہ رفتہ خود کو عقلِ کل سمجھنے لگی۔ مشورہ گراں گزرتا تھا۔ نصیحت تو بالکل برداشت نہ ہوتی تھی۔ وہ کیوں کسی کی مثال سُنے، کسی کی تقلید کرے۔ جبکہ انسٹاگرام پہ اُس کے ایوارڈ، تمغے اور جیت کی خبروں کے ساتھ لگی فوٹوز کے اتنے فالوزر تھے اُس کو لائیک کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔

''سجل نے کھانا ویسے کا ویسے چھوڑ دیا'' کھانے کی میز پر برتن دیکھ کر ممی نے ملازمہ سے پوچھا۔

''باجی'' وہ تو اپنے کمرے میں ہیں''

دردانہ نوشین خان

"کیا مطلب؟" "تم نے بُلایا نہیں؟"

"باجی! دوسری دفعہ گئی تو ڈپٹ دیا اب میرے کمرے میں نہ آنا" سفید سر والی ملازمہ کہہ رہی تھی ممی کی نظریں ندامت سے جھک گئیں۔

کھانا تو روز کا مسئلہ تھا ہی کہ آج کیا بنایا جائے کہ وہ خوشی سے کھائے مگر مسئلہ صرف کھانا نہیں تھا۔ والدین چاہتے تھے اُن کی اکلوتی بیٹی اُن کے ساتھ خاندان کی تقاریب میں ہمیشہ نہ سہی کبھی تو جایا کرے۔ وہ اپنوں میں اپنی اولاد کی کامرانیوں کا افتخار سمیٹنا چاہتے تھے مگر تجمل کا جواب "آپ نے انھیں بتا دیا...... بس اُن کو پتا ہے۔" اصرار کرتے تو مزید جواب ایسے ملتے۔

"میرے پاس ٹائم نہیں۔"

"میں نے کیا کرنا ہے وہاں"

"چینیڈ و دماغ لوگوں میں بور ہوتا ہے"

ممی نے اُن "کزنز کے" کے سکولز، کالجز کے نام گنوائے کہ وہ بھی تعلیم یافتہ ہیں تو تجمل کی اُکتاہٹ

"برتھ ڈے پہ تالیاں بجانے کے بجائے بکس پڑھ لوں اور کچھ نہیں تو سو جاؤں۔"

"ممی...... میں نے میلاد میں کیا کرنا ہے"

"مہندی...... اُف یہ کپڑے...... آپ کے زمانے کے بھرے ہوئے سُوٹ"

"یہ میرے زمانے کے نہیں، شنائر (Chinyere) سے خریدا ہے...... اور میں بھی اماں حوا کے زمانے کی نہیں ہوں۔"

"ممی...... میں ایسے کلر نہیں پہنتی" پہلے بھی آپ آصم جوفا کا سوٹ اُٹھا لائی تھیں۔

اور وہ الماری سے جینز کرتہ نکال لاتی۔ اگر کو ساتھ لے جانا کھونا نہیں ہے تو مسکرا کر یہی قبول کرنا ہوگا۔

احسان ہوتا تھا تجمل کا کہ وہ ماں کے ساتھ کہیں چلی جائے۔

اُس کے بابا تو اُس کی ذہانت پہ نازاں اور قانع تھے مگر ماں اولاد کو ہر پہلو سے کامیاب دیکھنا چاہتی ہے۔ تجمل کی ممی زمانہ طالب علمی سے نماز کی پابند تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کی بیٹی بھی نماز پڑھے اُس کے سرکل کی بھی کچھ بچیاں نمازی تھیں۔ اُن کی مثال دیتی تو تجمل کی اَنا کو ٹھیس لگتی۔ حدیث قرآن کے حوالہ جات میں بھی۔

"مجھے پتا ہے" کا جواب سنائی دیتا۔

"تجمل کے بابا...... میں تجمل کی کچھ عادات سے فکر مند رہتی ہوں۔

"عجب ناشکرا پن ہے...... ہمارے خاندان کا نام روشن کرنے والی بیٹی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے...... مگر وہ Rude بولتی ہے۔ ہمارے بہن بھائیوں کے گھروں میں کبھی نہیں جاتی۔ وہ اپنی ذات کے گنبد میں بند رہتی ہے۔"

"اس عمر میں بچوں کو دوست / کلاس فیلوز اچھے لگتے ہیں۔ وقت کے ساتھ سیکھ جائے گی"

پھر تجمل نے بورڈ میں تیسری پوزیشن لے کر میٹرک پاس کیا شہر کے معروف کالج میں رول نمبر ون بنی - والدین بہت خوش ہوئے۔ چھٹیاں آئیں تو ممی نے بہت کچھ سوچ ڈالا۔

"تجمل...... اب ہم شام کی چائے اکٹھے پئیں گے، تمھارے بابا مغرب کے بعد

آتے ہیں۔ میں دن بھر اکیلی ہوتی ہوں۔"
"اوکے ممی..... مگر مجھے صبح جلدی نہیں جگانا"
"اور سنیے..... گلگت کے ٹرپ کی پلاننگ بھی کرنا ہے۔"
"ممی مجھے اپنا پروجیکٹ مکمل کرنا ہے۔"
"ہاں..... ہاں..... سہولت سے میری جان"
"دیکھوں گی"
"سجل بیٹا..... اپنی روٹین میں نمازوں کو شامل کرو..... کم از کم تین سے شروع کردو۔ بس مائینڈ سیٹ کرنے کی بات ہے بیٹا"
"اوکے"

پہلے دن جو وعدے ہوئے ایک آدھ بار کے بعد فراموش ہو گئے۔ وہ کسی دن نماز ادا کر لیتی تو کئی دن اذانیں ہوتی رہتی وہ موبائل لیپ ٹاپ پہ مگن رہتی یا سوئی رہتی۔ یہ خیال خوش فہمی تھا کہ وہ چھٹیوں کے ایک دو روز آرام کے بعد گھر کی زندگی میں شامل دکھائی دے گی۔ وہ تو رات دیر تک جاگتی (رات کو جاگنے والوں کا دن کی زندگی میں حصہ کم ہوتا ہے) کبھی کبھی عصر کے بعد بیدار ہوتی، روزانہ غسل کرنا، لباس بدلنا، کنگھی کرنا یا گھر والوں میں مل بیٹھنا اُس کے ہاں فضول اور وقت کا ضیاع تھا۔ وہ اپنی مرضی کی مالک تھی۔

ایک دن اُس کی سہیلی نے ملنے آنا تھا (ویسے یہ لفظ سہیلی اب لڑکیوں میں متروک ہو چکا ہے) اُس دن اُس نے خود کو اچھا سا تیار کیا۔ شیمپو اور غسل کا وقت بھی مل گیا۔ حالانکہ چند روز پہلے ممی کی دوست خواتین کی آمد پر وہ ڈرائنگ روم میں سلام تک نہ کرنے گئی اور جس دن چچی لوگ آئے تو پہلے تو سوئی رہی پھر سامنے گئی تو رات والے شکن دار ملگجے کپڑوں میں، چچازاد بہن نے کہہ دیا۔

"دھو میں تو بہت ہیں تمھاری ذہانت کی، کچھ آؤٹ لک بھی بنا لو۔"
"میں فضول کاموں میں وقت ضائع نہیں کرتی" سُنک کر بولی
"کونسے فضول کام؟"
"شیشے کے آگے بناؤ سنگھار"
"صفائی نصف ایمان ہے" منہ بگاڑ کر اُس کے کپڑوں پر نظر ڈالی۔

سجل کچن میں جا کر ممی سے اُلجھ پڑی
"اس لیے میں ایسے لوگوں کے منہ نہیں لگتی۔ مجھے مت بلایا کریں۔ ممی نے مُڑ کر اُسے دیکھا۔

رات سے پہنی ہوئی سلوٹوں والی شرٹ..... کاٹن کا گھلا پاجاما، کل پرسوں سے بالوں میں بندھی پونی، اس لڑکی کے وارڈ روب کپڑوں سے بھرے ہوئے ہیں اس گھر کی اکلوتی اولاد ہے اس کے پاس کیا نہیں ہے۔ انعام گریڈ منہ پر نہیں لکھے ہوتے۔ لباس اخلاق ہر پہلو کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ انسان معاشرے میں جیتا ہے سب سے کٹ کر اپنی دنیا نہیں بنا سکتا یہ سب باتیں ممی نے کئی بار کی ہوئی تھیں۔

لیکن جس دن سجل کی دوست نے آنا تھا اُسے کمرے کی ترتیب وصفائی، خاطر تواضع اور خود اچھے حلیے میں ہونا، سب کا خیال تھا۔

دونوں لڑکیاں ہنس بول رہی تھیں گھر میں گھوم رہی تھیں۔ علیشاہ نے کہا۔

''آنٹی آپ خوش قسمت ہیں..... سجل جیسی آپ کی بیٹی ہے''

''الحمدللہ..... آپ کی امّی بھی خوش قسمت ہیں۔ آپ بھی بہت پیاری بیٹی ہیں۔''

''نہیں آنٹی..... میں کہاں..... سجل تو نمبر ون ہے۔''

''نمبر ون تو صرف اللہ کی ذات ہے باقی اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ بندوں میں سے اُسے زیادہ پیار کرتا ہوگا جو اُس کا حکم مانتا ہو۔'' ممی مسکرائی۔

''اچھا چھوڑو علیشاہ..... ممی پلیز دو کپ چائے کا میڈ سے کہہ دیجیے''

سجل علیشاہ کو لے کر لان میں چلی گئی۔

کچھ دیر کے بعد سجل خوشی سے نعرے لگاتی آئی۔

''ممی..... ممی..... I Won''

''کیا؟..... کیا بیٹا'' ممی خوشی سے آگے بڑھیں۔

''آل پنجاب میڈیکل سٹوڈنٹ کوئز''

''آنٹی اس کمپیٹیشن میں اتنے میڈیکل کے سٹوڈنٹ تھے یہ تو ابھی ایف ایس سی میں ہے'' علیشاہ خوشی سے نہال تھی۔

''ہاں..... میں نے چار ہزار چھ سو Participants میں Win کیا ہے''

وہ چمکتی ہوئی ہنسی سے ماں کے گلے لگ گئی۔

''الحمدللہ..... اللہ تجھے نظر بد سے بچائے میری چاند''

''My Sajal won always''

موبائل سن کر جیب میں رکھتے ہوئے بابا فرط مسرت سے آگے بڑھے اور سجل کا ماتھا چوم لیا۔

''ابھی تمہارے پرنسپل کا فون آیا ہے۔ مبارک باد دے رہے تھے۔ کہہ رہے تھے ہماری سٹار گرل کو Meteor star کا تمغہ ملے گا''

ممی خوشی خوشی صدقہ نکالنے دوڑی۔ ماں کا دل وسواس کا گھر ہوتا ہے بلندی کی خبروں کا تسلسل بھی وہم ڈالتا تھا اور یہ بھی خدشہ رہتا کہ سجل کے لیے اُس کی ہدایتیں جوں جوں کمزور ہو رہی ہیں۔ اُس کی اونچی اڑان میں ماں باپ بونے ہو گئے ہیں ممی کی باتیں مزید معمولی ہو گئی ہیں مثلاً

''بیٹا سب کے ساتھ دسترخوان پہ بیٹھا کرو''

''گھر کا کھانا صحت مند ہوتا ہے باہر کی ہوم ڈیلیوری کبھی کبھار کا شوق ہوتا ہے''

''شام کو بیڈمنٹن کھیلو، واک کرو جسم کو ایکٹو رکھو''

''بیٹا..... جمعہ کے جمعہ تو روزہ رکھو رمضان شریف میں''

اُسے تو دعائے قنوت نہیں آتی تھی۔ کس نماز میں کتنی رکعت فرض ہے وہ نہیں جانتی تھی۔ فرض اور سنت کی ادائیگی میں کیا فرق ہے۔ قرآنی سورتیں یاد نہ تھیں، تاریخ اسلام کے متعلق مکمل بد نہ تھی۔ قصص القرآن کو وہ ایسی کہانیاں سمجھتی جو بچپن میں پڑھی جاتی ہیں (نعوذ باللہ) ممی ان باتوں پہ کڑھتی تو پاپا کہتے۔

''دیکھو بیگم..... ہم نے جس قسم کی تعلیم اپنی بیٹی کو دلوائی اُس نے اُس نے بہترین سے کم نہیں لیا۔ اب یہ تو ہمارا قصور ہے کہ جس علم کی رغبت ہی نہیں دلائی گئی وہ اُس کو کیسے

اچھا لگے۔"

"یہ کوئی جواز نہیں، ہم نے یہ سب کسی دینی مدرسے سے نہیں سیکھا ماں باپ سکھاتے رہتے ہیں میں نے ناظرہ قرآن دادی جی سے سیکھا، نماز انھوں نے سکھائی۔ ہم لوگ بڑوں کی سنتے تھے۔"

"تمھارا مسئلہ یہ ہے کہ تم بیٹی کو ہر پہلو میں کامل دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اہم پہلو تو اہم ہوتے ہیں"

"اچھا...... فی الحال تو اُس کے انعام کی تقریب کی تیاری کرو"

Meteor star prize (شہاب ثاقب تمغہ) کی تقریب اعلیٰ درجے کی تھی۔ وزیر اعلیٰ مہمان خصوصی تھے۔ سب نے پوزیشن ہولڈر کو مبارک باد دی۔ سجل آغا کو اساتذہ نے خوب سراہا - شرکاء محفل نے تحسین کی۔ اور یہ فقرہ بار بار دہرایا گیا کہ:

"سجل ایک روشن ستارہ ہے"

سکارف والی ایک میڈیکل طالبہ نے سجل کو روک کر محبت سے کہا تھا۔

"گھر جا کر اللہ کا شکر ادا کرنا"

سجل کی رہی مسکراہٹ سے کچھ اندازہ کر کے اُس نے کہا

"ایک Link بھیج رہی ہوں۔ سجل...... Must watch"

"Sure...... تھینکس"

وہ خوش تھی،

نازاں تھی، مسرور تھی، مغرور تھی، زندگی کتنی خوبصورت اور آسان ہے۔ تعریف اُس کی پہچان ہے۔ انسان اپنی کاوش سے سب کچھ پا سکتا ہے۔ قسمت، دعا...... اور شکر...... شکر؟ اُسے وہ Link یاد آیا، دیکھا تو دیکھتی رہی نظر انداز نہ کر سکی اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ جدید انداز میں انگریزی بول کر احسن طریق سے تبلیغ کر رہے ہیں جو یوتھ کو متاثر کرتا ہے۔

سجل اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی سے درختوں کی چوٹیوں پر پھیلی چاندنی اور چاندنی کے پار آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ سیاہی مائل نیلگوں آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا اُس کے پاس رکھے موبائل پر انگریزی دھن بج رہے تھی۔

I Consider it a
challenge before the
whole human race and
i ain't gonna lose
we are the champions
no time for losers.

اے تاروں بھرے آسمان، میں بھی ایک ستارہ ہوں وہ مسکرا کر خود کلام ہوئی۔

تب ہی ایک ستارہ ٹوٹا اور روشنی کی ادھوری لکیر چھوڑتا ہوا گم ہو گیا۔ اُس کا دل زور سے دھڑکا جسم کانپ اُٹھا۔ چمکتا دمکتا ستارہ کیسے؟ کہاں چلا گیا۔ اور تاروں بھرے آسمان کو کوئی فرق نہ پڑا۔

"یا اللہ......

مجھے معاف کر دے"

وہ کھڑکی میں سر رکھ کر رو پڑی۔

ماں کی دعا رنگ لائی تھی۔

☆☆☆☆☆

بہو کی بپتا

صبا ممتاز بانو

ہر گرمیوں میں اس کے سسر گھر کی عورتوں کے لئے لان، کاٹن کے کپڑے لاتے تھے۔ اس دفعہ بھی وہ اس کی ساس، نندوں اور اس کے لئے تین تین سوٹ لائے تھے۔ اس کا دل چاہا، وہ بھی جا کر دیکھے اور پھر اپنی پسند کے سوٹ الگ کر لے۔ اس کی ساس اور نندوں ماروخ اور ماہا نے جب اپنے کپڑے، اپنی مرضی کے رنگ، ڈیزائن منتخب کر لئے تو اس کے کپڑے خود بخود الگ ہو گئے۔ اس نے ڈبڈبائی نگاہوں سے اس منظر کو سوچا، جب اس کے پاپا کوئی چیز لاتے تھے تو اسے آواز دی جاتی تھی اور پھر جب وہ اپنی مرضی سے پسند کر لیتی، تب دوسروں کی باری آتی تھی۔ آج سسرال میں کسی اور کی مرضی چلتی اور اس کی باری دوسروں کے بعد آتی تھی۔

شام کو جب فواد (اس کا شوہر) آیا تو اس کے ہاتھ میں پھلوں کے بیگز تھے۔ بیگز اس نے ماں کو دیئے۔ اس کی ساس نے سب میں برابر برابر پھل تقسیم کرنے کی کوشش تو کی، مگر یہ کوشش ایسی تھی کہ اس کی نندوں کے حصے میں پانچ پانچ کیلے اور تین تین سیب آئے، جبکہ اس کے حصے میں تین کیلے اور ایک سیب۔ یقیناً یہ ایک کوشش تھی، جس کے حتمی نتائج بارے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اسی لئے تو کامیاب نہ رہی، مگر ہر دفعہ تقسیم پر گڑبڑ اسی کے ساتھ کیوں ہوتی تھی......؟

سحری کے وقت وہ گرم گرم پراٹھے تیار کر رہی تھی۔ ایک طرف اس نے چائے رکھی ہوئی تھی۔ اس کی ساس صاحبہ ہدایات دے رہی تھیں۔ اس کی نندیں سب کو باری باری کھلاتی جا رہی تھیں۔ ہر کوئی اپنے وقت سے اُٹھتا۔ لہٰذا اسی حساب سے گرما گرم کھانا اس کے آگے رکھا جاتا۔ سحری کا وقت ختم ہونے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا۔ اسے اپنے روزے سے زیادہ یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ سب وقت پر فارغ ہو جائیں۔ اذان کی آواز آئی تو اس نے جلدی جلدی خود بھی تھوڑا بہت کھایا۔ اس کی ساس اور نندیں قرآن اور نماز میں مشغول ہو گئیں۔ اس نے برتن دھوئے اور پھر نماز ادا کی۔ اس کے بعد قرآن کھولا ہی تھا کہ مُنا جاگ گیا۔ سارا دن مُنے کی ناز برداری اور افطاری کی تیاری میں لگ گیا۔

روزہ کھلنے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس کی نندیں وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ اس نے دسترخوان لگایا۔ دسترخوان چیزوں سے بھر گیا۔ بریانی، سموسے، پکوڑے، چاٹ، کھجوریں، شربت، دودھ۔ اس کا شوہر اور دیور بھی وقت پر گھر آ گئے تھے۔ سب دسترخوان کے گرد جمع ہو گئے۔ اذان کی صدا بلند ہوئی تو وہ بھی ایک طرف بیٹھ گئی۔ کھجور پکڑی، پانی پیا اور چیزوں کا انتظار کرنے لگی۔ جب سب اپنی اپنی پلیٹوں میں چیزیں ڈال لیتے تو اس کی طرف بڑھا دیتے۔ اس انتظار میں اس کے پاس کئی دفعہ خالی ڈونگے بھی منہ چڑاتے ہوئے آ جاتے، جس کا یقیناً گھر والوں کو پتا نہیں ہوتا تھا۔ ان کے خیال میں وہ بھرے ہوئے تھے۔

ٹی وی پر اس کا پسندیدہ پروگرام چل رہا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی، مگر اس کی نند دوسرا پروگرام دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ ضد کہاں کر سکتی تھی......؟ ضد تو دُور کی بات، اسے تو یہ بتانے کا حق بھی نہیں تھا کہ وہ دوسرا پروگرام دیکھنا چاہتی ہے۔ اس نے بچے کو پکڑا اور نیچے چلی گئی۔ وہ صفائی کر رہی تھی، اچانک گانا سننے کو دل چاہا تو ٹیپ ریکارڈر لگا لیا۔ اس کی ساس تک آواز پہنچی تو بولی۔

”تمہیں نہیں پتا، بجلی کا کتنا بل آتا ہے......؟ بل کیا تمہارا باپ آ کر دے گا......؟“

اس نے ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا۔ دوسرے کمرے میں اس کی بڑی نند کمپیوٹر پر گیم کھیل رہی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک دم خیال آیا۔

”بل......؟“

مگر دوسرے ہی لمحے دوسرا خیال۔

”ہاں، مگر اس کا باپ دے گا۔“

جب وہ میکے گئی تو شدید بیمار تھی۔ وہ وہاں جا کر بیمار نہیں ہوئی تھی، بلکہ سسرال میں جب بیمار ہوئی تو اس کی ساس نے اس کے شوہر کو حکم صادر کیا۔

”جن کی بیٹی ہے، ان کے پاس چھوڑ آؤ۔“

اس کا شوہر، وہ تو کاٹھ کا پتلا تھا۔ وہ بیوی سے پیار تو کرتا تھا، مگر پیسے خرچ کرنے میں اس کی جان جاتی تھی۔ اس نے بیوی کو بس میں بٹھایا اور روانہ کر دیا۔

''سنو.....! جب ٹھیک ہو جاؤ تو اطلاع کر دینا، اور ہاں، آتی دفعہ کرایہ اپنے بھائیوں سے لے لینا۔ منے کے کچھ کپڑے بھی لیتی آنا۔ لاہور سے کپڑے اچھے ملتے ہیں۔ پیسے اپنے بھائیوں سے لینا۔ آخر ان کی کمائی پر بھانجے کا بھی تو حق ہے۔''

وہ بولنا چاہتی تھی، مگر ایک بات نے اس کے ہونٹ سی دیئے۔ اسے یاد تھا، ایک دفعہ اس نے صدائے احتجاج بلند کی تو اس کی ساس نے کہا تھا۔

''اسے وہیں بھیج دے جن کی یہ زیادہ طرفدار ہے۔ اسے میکے والوں کی کمائی کی تو بڑی فکر ہے، مگر شوہر کے پیسوں کی پرواہ نہیں۔''

منا کی پیدائش سے لے کر اب تک اس کے زیادہ تر کپڑے اس کے میکے والوں سے آتے تھے، مگر اب اس کے بھائی، بھابیاں ان کے اپنے بچے بھی تھے۔ جب وہ میکے پہنچی تو بھابی نے رسمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا، جس میں ناگواری کی جھلک چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ بھابی نے اس کے بیمار وجود کو دیکھا۔ بھائی بھی بدلا بدلا سا تھا۔ اس دفعہ وہ بھی بول اُٹھا۔

''وہ تمہارا شوہر ہے، اس کی بیوی ہو تم، وہ تمہارا علاج کیوں نہیں کراتا.....؟''

ایک کان میں بھائی کے الفاظ گونج رہے تھے، دوسرے میں شوہر بول رہا تھا۔

''اپنی بہن بیٹی کا علاج اگر وہ کرا دیں گے تو فرق نہیں پڑ جاتا۔''

جب وہ کسی کی بیوی بن گئی تھی تو بہن بیٹی کا رشتہ رسمی اور برائے نام رہ گیا تھا اور جب تک اس کے ماں جائے زندہ تھے، تب تک اس کا شوہر اسے صرف اور صرف اپنی بیوی سمجھنے پر تیار نہیں تھا۔ شاید وہ ان سب کے مرنے کا انتظار کر رہا تھا۔

اس کی ساس ہمیشہ یہ اعتراض کرتی تھی کہ وہ کام اچھا نہیں کرتی۔ اس کے ہر کام میں انہیں کوئی نہ کوئی خامی نظر آ ہی جاتی۔ اس کی نندیں اگر کوئی غلط کام کرتیں تو وہ انہیں بچیاں قرار دیتی اور ان کی غلطی بلکہ خامیوں کو بھی بچگانے پن یا نادانی کا نام دیا جاتا اور جب وہ کوئی غلطی کرتی تو اسے کم عقلی، پھوہڑ پن، حماقت اور پاگل پن کا نام دیا جاتا۔ وہ اکثر سوچتی۔

''ایک ہی غلطی دو افراد کریں یا ایک ہی خامی دو افراد میں پائی جائے تو ایک کو الگ القابات اور دوسری کو الگ خطابات کیوں.....؟''

مگر پھر وہ یہ سوچ کر اپنے ذہن سے اس خیال کو جھٹک دیتی۔

''میری ساس ٹھیک ہی کہتی ہوگی، کیونکہ وہ غلط ہو ہی نہیں سکتی۔''

اس کی ساس اچھی تھی یا بری، مگر پوتے کو بہت پیار کرتی تھی۔ وہ اس کے صدقے واری جاتی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتی

تھی کہ چلو اس کے بیٹے کو تو بھرپور پیار مل رہا ہے۔ وہ تھا تو اس کا لختِ جگر، مگر ایک دن اس کی ساس بولی۔

''میں تو اسے اس لئے پیار کرتی ہوں کہ یہ ہمارا خون ہے۔ تو جانا چاہے تو جا، مگر یہ ہمارا ہے۔ دیکھ اس کی شکل بھی اپنے باپ سے ملتی ہے۔''

اس نے آہ بھری۔

''اس ننھے خون کو دُنیا میں لانے کے لئے میں نے اسے اپنے خون سے سینچا۔ کیا اس ننھے پودے میں صرف اس کے باپ کا خون شامل ہے.....؟ میرا خون کیا ہوا.....؟ شاید یہ اسی لئے دادی کی توجہ کا مرکز ہے کہ اس کی شکل اس کے باپ سے ملتی ہے، مجھ سے نہیں۔''

مگر اب کی بار بات پھر دل میں ہی رہ گئی۔ دل کی بات زبان تک لانے کا حق تو صرف اس کی ساس یا نندوں کو حاصل تھا۔ اسے بہت بھوک لگی تھی۔ لگتی بھی کیوں ناں.....؟ وہ دو دن سے بھوکی تھی۔ وہ صبح تو بجے اُٹھی تو ساس کا منہ سوجھا ہوا تھا۔

''مہارانی.....! اُٹھ گئیں دس بجے، ناشتے کے وقت آنکھ کھل گئی کہ تیار ہو گیا ہوگا، جا کر ٹھونس لوں۔''

اس نے طبیعت کی خرابی کا بتانا چاہا، مگر اس کی ساس نے اس کے اس جواز کو عذر کا نام دے دیا۔ وہ اسے عذر سمجھتی، بہانہ یا حیلہ یا مکاری، وہ کیا کر سکتی تھی.....؟ مگر اس نے کھانا نہیں کھایا۔ کچھ طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ مرتے مرتے وہ گھر کا کام کرتی رہی۔

اس کی ساس نے سمجھا۔

''یہ اکڑ کر فاقہ کشی پر اُتر آئی ہے۔''

اس نے اسے اور بھی تیروں سے چھلنی کرنا شروع کر دیا۔ اسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ کسی نے اسے کھانے کے لئے نہیں پوچھا۔ دوپہر کو جب اس کی ساس سو گئی اور نندیں کالج سے نہیں لوٹی تھیں، وہ گھر کا کام کرنے کے بعد پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ بھوک سے اس کی جان نکل رہی تھی۔ کوئی باسی روٹی بھی نہیں تھی کہ وہ کھا لیتی۔ صحن میں گندے برتن دھوتے دھوتے وہ بے ہوش ہو کر گرنے کو تھی کہ کہیں سے ایک کوا اُڑتا ہوا آیا۔ اس نے منڈیر سے روٹی کا ٹکڑا اُٹھایا۔ گرتی ہوئی فلک کی جان میں جان آ گئی۔ اس نے ''شش'' کہا۔ کوا روٹی کا ٹکڑا چھوڑ کر اُڑ گیا۔ فلک نے فلک کے لئے زندہ رہنے کا سامان کر دیا تھا۔ وہ بھاگی، ٹکڑا اُٹھایا، اسے منہ میں ڈالا اور پھر منڈیر پر پڑی روٹیوں کے ٹکڑے اپنے معدے میں ڈال لیے۔ اس کی ساس جانوروں کے حقوق کا بہت خیال رکھتی تھی۔ وہ ہر روز باقاعدگی سے بچی کھچی روٹیاں، سالن وغیرہ منڈیر پر ضرور ڈالتی تھی۔ اس کا خیال تھا۔

''جانور بے زبان ہوتے ہیں، ان کا خیال رکھنے سے اللہ خوش ہوتا ہے اور رزق میں برکت ہوتی ہے۔''

☆☆☆☆☆☆

ضدی

کبھی کبھی مدتوں میں گزری ہوئی زندگی ایک لمحے میں ڈھل جاتی ہے۔ بالکل اک زندہ لمحے میں اور یوں لگتا ہے کہ ہم تو بس یہیں کھڑے تھے کسی کی یاد کے منبر پر انتظار وقت بن کر منجمد ہو گیا تھا پھر جسم پر وقت، عرصہ، مدتیں گزرتی رہیں مگر وہ ایک قیمتی لمحہ تو یہیں کہیں رہ گیا تھا۔ ویسے تو وہ سب کچھ سمیٹ کر یاد کے اس حسین جزیرے سے رخصت ہوئی تھی۔ تب خوابناک آنکھوں میں خواب کے جھولے گول گول گھومتے تھے۔ دل کے آسمان پر پہنچنے والے خیالات زمین پر آتے تھے۔ لمحے لمحوں سے گلے مل کر اس کے چہرے کا ڈمپل بن جاتے۔ سرمئی آنکھوں میں کئی رنگ مچلتے۔

جب ایک دن اچانک ہی کسی نے کہاں تھا، سمجھ نہیں آتا تمھاری آنکھوں کا رنگ کیا ہے۔ خوبصورت اور پُرکشش ہیں مگر کبھی ان پر غور کرنے کا موقع دیجیے۔

اور وہ ''اپالو'' کے اس مجموعے کو دیکھتی رہ گئی۔ اس نے غور سے اُسے دیکھا کیا یہ وہی ہے، جو لفظوں کو اتنی کنجوسی سے استعمال کرتا ہے کہ گویا لفظ بولنے پہ ٹیکس لگتا ہو، اچھا جناب اب مرد بھی بولنے لگے۔ سمیہ نے پوچھا۔ جب کوئی اچانک ہی زندگی بن کر آئے تو یہ ممکن ہو جاتا ہے جنید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلی۔ یہی مسکراہٹ تھی، جسے وہ دیکھنے کے لیے بھائی سے کہتی کہ کوئی لطیفہ سنائیں کوئی مزاحیہ بات کریں۔ اس پتھر چہرے میں زندگی کے آثار پیدا ہوں۔ اور آج بغیر کسی وجہ کے۔ یا اللہ خیر۔ پتھر میں جونک کیسے لگی۔ لمحے گرفت میں کیسے آئے۔ کوئی قطبی ستارا کب گزرا۔ قسمت پلٹتے دیر نہیں لگی تھی۔ اس نے جلدی سے دوپٹہ سنبھالا اور کمرے میں بھاگ گئی۔ جنید کی بدلی ہوئی شخصیت پر سوچنا چاہتی تھی اس کی آنکھوں میں مچلتے کسی ان دیکھی مسکان کے رنگ اُسے پریشان کر رہے تھے۔ ایسا کیا ہوا تھا۔ کب ہوا تھا وہ لمحوں کو رول بیک کر کے اندازہ لگانا چاہتی تھی۔

فیملی کی تقریباً سبھی لڑکیاں، اس پر قربان ہو

آسناتھ کنول

ہو کر مایوس ہو چکی تھیں اور تھک ہار کر شادیاں کروا، اپنے اپنے گھروں میں شاد و آباد تھیں۔ جنید ملک، مکوں کے خاندان کا چہرہ مہرہ، جیسے ویسے ہی تعریفوں نے ساتویں آسمان پر بٹھا رکھا تھا۔ سمیہ ذرا چھوٹی تھی پسند یدہ کیا ہے اس نے ایسا کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ اپنی پڑھائی میں مگن۔ لائق سٹوڈنٹ۔ جنید بے شک تایا زاد تھا، مگر جنید کی کچھ سخت اور مغرور طبیعت کی وجہ سے سب اس سے دور ہی رہتے تھے۔ صرف آزر بھائی سے دوستی کی وجہ سے وہ سمیہ کے گھر آتا جاتا رہتا۔

اس لیے خاندان والوں نے مایوس ہو کر اپنی اپنی بیٹیوں کی شادیاں کرنی شروع کر دیں چچا زاد سارا ملک نے کافی اودھم مچایا۔ رونا پیٹنا کیا، منت ترلے مگر جنید ملک کے دل کا پتھر نہ پگھلا۔ پڑھائی اور کاروبار سے فرصت ملی تو اس کی نظر سمیہ پر پڑی۔ ہمیشہ کی طرح ہنس مکھ زندہ دل اور ذہین لڑکی۔ بے شک وہ اُس سے دس سال چھوٹی تھی مگر عمروں کا کیا ہے۔ یوں زندگی میں پہلی مرتبہ، جنید کے دل میں کسی لہر نے سر اُٹھایا تھا۔ اور وہ پور پور سمیہ ملک کی تازہ دم شخصیت میں ڈوبتا چلا گیا۔ چھوٹے چچا کی لاڈلی بیٹی۔

سمیہ نے آئینے میں دیکھا بھلا مجھ میں کیا خاص بات ہے۔ خاندان کی تقریباً سبھی لڑکیاں ایک سے بڑھ کر ایک تو اس کو پسند نہیں اور میں سادہ سی پڑھاکو لڑکی، کیسے آخر کیسے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی مگر کیوپڈ اپنا تیر چلا چکا تھا۔ کسی کو چاہنا اور چاہا جانا اچھا لگتا ہے۔ وقت دونوں کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ خرام چلنے لگا۔ سمیہ ایم ایس سی سائیکالوجی کے آخری سمسٹر میں تھی گھر میں رشتہ کی باتیں ہونے لگیں، تو جنید کا سراپا اپنے آپ آنکھوں میں اُتر آیا۔ وقت نے دبے پاؤں کچھ پھول اس کے دل میں کھلائے تھے۔ کچھ خواب پلکوں میں دیئے بنے تھے مگر تایا کی فرمائش کے باوجود بابا جان کا انکار کسی کی سمجھ میں نہیں آیا اور وہ تو حیرت سے گنگ تھی۔ ابا کے سامنے کبھی اونچی آواز میں بات ہی نہیں کی تھی۔ سب کچھ بغیر مانگے ہی ملتا رہا۔

ابا کو یہ خبر ہی نہیں تھی کہ جنید ملک سمیہ کے دل کے تخت پر براجمان ہو چکا ہے۔ آزر بھائی نے پوچھا تھا کہ انکار کی وجہ کیا ہے، تو ایک ہی جواب وہ میری بیٹی کے لائق نہیں۔ خاندان کا سب سے بانکا سجیلا لائق فائق لڑکا ان کی بیٹی کے لائق نہیں تھا، جنید کی فیملی والے سب حیران تھے سب جتن کر لیے۔ سمیہ ابا کی ضد کو تو جانتی تھی ایک دفعہ انکار ان کے منہ سے نکل گیا ہے اب وہ مر بھی جائیں تو ہاں نہیں کریں گے۔

ماں نے کہا سمیہ تم خود ابا سے بات کرو۔ اماں ایک بات بتا دوں۔ ابا نے اگر مجھے

انکار کر دیا، تو پھر میں اس گھر میں کبھی واپس پلٹ کر نہیں آؤں گی۔ مجھے یہ عادت بھی تو ابا سے ملی ہے۔

اور پھر وہ قیامت خیز دن طلوع ہوا۔ ابا حویلی کے بڑے سے صحن میں برگد کے نیچے بڑے سے تخت پوش پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

ابا آپ سے بات ہو سکتی ہے۔ ابا نے اخبار نیچے کر کے دیکھا سمیہ اک عزم لیے باپ کے روبرو تھی۔ ہاں ہاں میری جان میری لاڈو۔ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔ بہت مصروف رہتی ہو کبھی اس بوڑھے باپ کی بھی خبر لیا کرو۔ ابا نے شکوہ کیا۔ ابا جان آپ کے اردگرد ہی رہتی ہوں۔ بس آپ کو نظر نہیں آتی۔ ابا نے چونک کر اُسے دیکھا۔ ماتھے پر بل بھی پڑا۔ جنید ملک کو انکار کی وجہ کیا تھی۔ بس یہ جاننا چاہتی ہوں اور یہ جاننا میرا حق بنتا ہے اور ابا تو جیسے کسی انکار پر بیٹھ گئے ہوں۔ تم یہ کیوں جاننا چاہتی ہو، تیور بدلے ہوئے تھے۔ میں ایک پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہوں۔ اپنے اچھے بُرے کی پہچان رکھتی ہوں۔ میری بھلائی اور بہتری کس میں ہے یہ بھی جانتی ہوں، کبھی آپ لوگوں کی عزت پہ داغ نہیں لگنے دیا۔ اپنی عزت کرنا اور کروانا بھی جانتی ہوں۔ اس سب کے باوجود مجھ سے رائے مانگے بغیر رشتہ ٹھکرا دیا، انصاف ہے؟ بولیے۔

ہاں انصاف ہے، ابا دھاڑے۔ وہ لڑکا اس قابل نہیں رہ گیا۔ ساری زندگی رشتے پیش کرتے رہے اس نے کبھی پرواہ نہیں کی۔ سارے خاندان کی لڑکیوں کو اس نے ریجکٹ کیا، حتیٰ کہ میرے خاص دوست اور پاٹنر رضوان بیگ کی اکلوتی بیٹی کو انکار کر دیا۔ میں اسے پسند نہیں کرتا اور میں اپنی بیٹی سے ہرگز اس کی شادی نہیں کروں گا۔

آپ کے دل میں اتنی نفرت ہے تو پھر میرے لیے محبت اور نرمی کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر میں کہوں کہ مجھے جنید پسند ہے تو سمیہ کا لہجہ بھی سخت ہو گیا۔ ہرگز نہیں پھر بھی نہیں کبھی نہیں۔

تو پھر میرا فیصلہ بھی سنا لیجیے۔ اگر جنید نہیں تو کوئی اور نہیں ضد تو پھر ضد ہوتی ہے نا، ابا نے حیرت سے سمیہ کو دیکھا۔

تم بغاوت کرو گی، نہیں بغاوت نہیں، مگر کبھی شادی نہیں کروں گی اور دوسری بات میں سکالرشپ پر ملک سے باہر جا رہی ہوں، پہلے تو شاید نہ جاتی، مگر اب مشکل ہے یہاں رہنا۔

ابا کا تو پارہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ وہ سمیہ کو قتل ہی کر دینا چاہتے تھے آزر بھائی اور اماں نے بمشکل ٹھنڈا کیا۔ آپ مان کیوں نہیں جاتے ماں نے اشکوں بھری التجا کی میرے سامنے نام مت لو اس بدبخت کا مذاق بنا رکھا ہے۔

جنید کو بھی اس بات کی بھنک پڑ گئی تھی وہ اپنی جگہ شرمندہ رہنے لگا، چچا اس سے اتنی نفرت

کرتے ہیں، مگر کبھی ظاہر نہیں کی، مگر سمیہ کے ساتھ ان کا رویہ اُسے اچھا نہیں لگا۔ یہ زیادتی ہے چچا جان کی، وہ بہت دکھی تھا کڑھتا رہتا، سمیہ سے ملنا چاہتا تھا مگر اب وہ چچا کے گھر نہیں جا سکتا تھا، گھر میں جیسے ایک سوگ پھیلا ہوا تھا، سب ایک دوسرے سے نظریں چراتے پھرتے، وقت نے رینگنا شروع کر دیا۔ ایک دن سمیہ نے رختِ سفر باندھ لیا۔ ماں نے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ ابا کو تخت پوش پر چپ چاپ لیٹے دیکھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہوں، دور سے ہی سلام کیا۔

اور بھائی کے ساتھ سامان تھامے گھر سے نکل گئی ہمیشہ کے لیے، وہ چاہتی تھی ابا کو اس کی کمی محسوس ہو، وہ اپنے رویے پر غور کریں۔ شاید وہ اپنے اندر کی نفرت کو کم کر سکیں۔

ابا خاموش لیٹے دھوپ سے بھرے آسمان کو تک رہے تھے اکا دُکا پرندے ادھر سے اُدھر اُڑتے پھرتے تھے کہیں کہیں بادل بھی سرگوشیوں میں مصروف تھے پتوں کی تال برابر جاری تھی۔ جب اماں آنسو صاف کرتی ابا کا کھانا لیے چلی آئی۔

ابا نے غور سے بیوی کو دیکھا۔ کیا ہوا؟ کوئی مر گیا ہے کیا خاندان میں کچھ نہیں آپ کھانا کھائیں۔ آپ کو کیا کوئی مرے یا جیے۔ ہوا کیا ہے۔ ابا اُبل ہی پڑے کچھ بتاؤ گی۔ سمیہ چلی گئی ہے۔ کیا وہ زور سے چیخے۔ کہاں چلی گئی ہے۔ کسی خدشے کے پیشِ نظر وہ بدحواس ہو گئے۔ میری اجازت کے بغیر وہ تڑپ کر رہ گئے۔ آپ کی بیٹی ہے۔ آپ پر ہی گئی ہے۔ آنسو تواتر سے اُس کا آنچل بھگو رہے تھے۔ آزر چھوڑنے گیا ہے اچھا وہ بدمعاش اس سے ملا ہوا ہے جنید کا چمچہ اُسے آلینے دو پوچھتا ہوں اس سے۔ اب کیا بیٹے کو بھی گھر سے نکالیں گے۔ وہ دہل کر رہ گئی۔ اُٹھا لو یہ کھانا۔ وہ پوری جان سے سلگ رہے تھے۔ بیٹی کے پر نکل آئے تھے۔ ساری زندگی خاموش رہنے والی نے بلا خر کیا تیر مارا تھا۔ ابا جانتے ہی نہ تھے کہ ان کی ضد کی قیمت ان کی اولاد کو چکانی ہوگی۔ آزر دکھی دل کے ساتھ بہن کو رخصت کر آیا۔ بہت اداس اور کھویا کھویا سا۔ جیسے کچھ گم ہو گیا ہو۔ ابا سے خوب لڑائی ہوئی۔ سارا الزام آزر پر آ گیا وہ چپ چاپ اپنے کام پر نکل جاتا۔ اماں سارا دن اُداس گھومتی۔ ابا چپ چاپ آسمان کو گھورتے رہتے۔

قیامت تو جنید کے دل پر گزری تھی۔ اس کی محبت میں کھوٹ نہیں تھا۔ سمیہ نے بہادری دکھائی۔ اپنے حق کے لیے آواز اُٹھائی۔ جنید نے بھی کہیں شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ سمیہ کی یاد سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں تھا۔ اس نے اپنا بزنس اسلام آباد منتقل کر لیا۔ وہ لاہور کو بھول جانا چاہتا تھا۔ وقت آگے سرکتا رہا۔

تایا جان کی بیماری اور موت نے سارے خاندان کو اکٹھا کیا۔ جنید بھی موجود تھا ٹوٹا ہوا مرجھایا سا۔ بابا کی موت نے اُسے مزید توڑ دیا تھا۔ چچا بھی آئے تھے ملے بھی تھے۔ شاید افسوس کے چند کلمات بھی کہے تھے۔ آزر بھی

وہیں تھا۔ ایک دن آزر نے ہی کہا تھا یار کہیں شادی کر لے تایا کی حسرت ہی رہ گئی تجھے دولہا بنانے کی، آزر یار یہ دلوں کے سودے ہیں مشکلوں سے طے ہوتے ہیں۔ تو جانتا ہے میں نے ساری زندگی کسی لڑکی کو گھاس نہیں ڈالی۔ سمیہ کیوں پسند آگئی تھی نہیں جانتا۔ بس پھر اس کے معیار کی کوئی لڑکی دنیا میں ہے ہی نہیں۔ سمیہ نے شادی نہیں کی تو میں کیسے کر سکتا ہوں اس کا گنہگار بن جاؤں گا۔ جنید تمہیں سمجھنا مشکل ہے۔ سر پہ سفید بالوں کے ساتھ اور گریس فل ہو گئے ہو مذاق نہ اڑاؤ وہ مسکرایا۔ سارے خاندان میں بس اسی جوڑے کے چرچے تھے۔ ابا کی سخت طبیعت کی وجہ سے کوئی ان سے بات نہیں کرتا تھا۔ ابا بیمار رہنے لگے تھے۔ مدتوں سے بیٹی کو نہیں دیکھا تھا وہ کبھی واپس ہی نہیں آئی۔ کہاں آتی، کیسے آتی، بس آزر سے ٹیلی فونک رابطہ تھا کبھی کبھار ماں سے بات کر لیتی۔ گھریلو حالات اور تایا کی موت نے اُسے آزردہ کیا تھا۔

ابا کی طبیعت دن بدن خراب رہنے لگی پہلے والا طنطنہ باقی نہ رہا تھا۔ اب خود کو تایا کی موت کا ذمہ دار سمجھتے۔ جنید اور سمیہ کے ساتھ زیادتی کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔

آزر میری بات سنو، وہ کمزوری سی آواز میں بولے۔ جی ابا، وہ جنید اور سمیہ کو بلاؤ میں۔ مرنے سے پہلے پہلے ان کا نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ ابا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ سمیہ نے اپنی زندگی معذور بچوں کے ایک ادارے کے لیے وقف کر دی ہے۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ بس ایک دفعہ اُسے بتاؤ۔ یہ میری آخری خواہش ہے میں نے جنید بیٹے کو بڑا دکھ دیا ہے وہ تو کتنا سعادت مند بچہ ہے مجھے پتہ ہی نہیں تھا۔ میں ان دونوں کا مجرم ہوں۔

ان سے کہو مجھے معاف کر دیں۔

ابا آپ خود کو سنبھالیں میں بات کرتا ہوں۔

اور پھر دس سال کے طویل عرصے کے بعد سمیہ نے اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا۔ وہ کتنی سوبر ہو گئی تھی ڈاکٹر پروفیسر سمیہ ملک انگلینڈ کی ایک شاندار یونیورسٹی میں سائیکلوجی کی پروفیسر تھی۔

السلام علیکم ابا! آپ کیسے ہیں وہ اپنی پروفیسر بیٹی کو دیکھ کر اُٹھ بیٹھے۔ اتنی بارعب اور شاندار خاتون۔ کیا یہ ان کی بیٹی ہے۔ وہ کتنی ہی دیر اُسے دیکھتے رہے۔ ابا کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے مجھے معاف کر دو۔ میں بڑی اذیت میں ہوں۔ میری آخری خواہش کو پورا کر دو۔ جنید کو بھی بلوا لیا گیا۔ سمیہ کے لاکھ انکار کے باوجود جنید نے اُسے منا ہی لیا تھا۔ پہلی مرتبہ انکار میں اُٹھے ہوئے اس کے ہاتھ کو جنید نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے لیا۔ موم کی طرح پگھل گئی۔ محبت سے بڑھ کر اس دنیا میں ابھی کچھ ایجاد نہیں ہوا۔ کچھ ہی دنوں میں سارے خاندان نے دیکھا محبت فاتح عالم ہو گئی تھی۔ چلتے ہوئے جھگڑتھم گئے تھے۔ دونوں ضدی تھے محبت کو کیسے جانے دیتے۔

☆☆☆☆☆

جب زرد ہو موسم اندر کا

نیلے آسمان پر رقص کرتے زرد اور سرخ رنگ نے سورج کے ڈوبنے کی چغلی کر دی تھی دور اُفق پر سورج کو دھیرے دھیرے سمندر میں ڈوبتے دیکھ، اس کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ سورج کے ڈوبتے ہی رقص کرتے سنہرے رنگوں کو شام کی سرمئی سیاہی نے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ تیز لہریں اُمڈ کر آتیں، اس کے ننگے پاؤں سے لپٹ جاتیں اور اس کے پاؤں ریت میں اور گہرے دھنس جاتے۔ اس نے پاؤں نکالنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ دھیرے دھیرے اس کا وجود ریت میں پوری طرح دھنس جائے، سمندر اسے نگل جائے۔ رات کی سیاہی میں اس کا وجود بھی معدوم ہو جائے۔ اس کا آفتاب بھی غروب ہو چکا تھا جس کے دم سے اس کی زندگی میں رنگ تھے، بہار تھی، رونق تھی۔ تمام عمر اس نے پرچھائیں کے پیچھے بھاگتے گزاری پھر بھی وہ مطمئن تھی اور آج اس کا یہ بھرم بھی ٹوٹ گیا۔ میگھنا کی دھیمی آواز میں کہی گئی وہ لمبی گہری باتیں اس کے اندر خنجر کی طرح اتریں اور اس کے وجود کو نوچ کھروچ کر ریزہ ریزہ بکھیر گئیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ میگھنا نے جو کچھ کہا وہ حسد تھا، انتقام تھا یا حقیقت جس سے وہ اب تک نا آشنا تھی۔

محبت کسی رسم و رواج کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس کی بنیاد یقین، اعتبار، اعتماد پر ٹکی ہوتی ہے جسے قائم کرنے میں عرصہ گزر جاتا ہے۔ انورادھا نے بھی رونق پر آنکھ بند کر کے اعتبار نہیں کیا تھا۔ رونق کو کئی سال لگ گئے تھے اس کے دل میں مستقل گھر بنانے میں۔ یہ بھی سچ ہے کہ پیار اندھا ہوتا ہے۔ نہ یہ ذات دیکھتا ہے نہ مذہب نہ عمر۔ بہکنے کی عمر میں کوئی انورادھا کو بہکا نہ سکا اور سنبھلنے کی عمر میں اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ دوستی کی آڑ میں تیزی سے بدلتے جذبات کو روکے رکھنے کی اس نے لاکھ کوشش کی مگر جذبات کا سیلاب کبھی کبھی مضبوط بنیاد کو بھی ہلا دیتا ہے۔ محبت کا طوفان بھی اسے اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ اس کا وجود ڈوبنے سے نہ بچ سکا۔ دل کی دھڑکنیں کیا تیز ہوئیں، دماغ کے سوچنے کی رفتار کم ہو گئی۔ محبت کے تیز جھونکے نے دل کے دریچے کھول دیے اور عقل کے سب دروازے بند ہو گئے۔

رینو بہل

محبت کی خوشبوں میں اس کا وجود مہک اٹھا۔ انجام کی فکر کیے بغیر وہ اس آگ میں کود گئی۔ اس وقت اسے پندرہ سال عمر کا فرق بھی نظر نہ آیا۔ یہ بھی نظر نہیں آیا کہ وہ کسی اور سے منسوب ہے۔ اس کا اپنا ایک نشیمن ہے جس میں دو معصوم بچے بھی ہیں اور جس کے دروازے اس پر ہمیشہ بند رہیں گے۔

رونق نے اس سے کبھی کچھ چھپایا نہیں اور نہ ہی عمر بھر ساتھ نبھانے کے لیے زور زبردستی کی۔ رونق کی بے پناہ محبت نے اسے کبھی کسی اور کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہونے دی۔ اس نے رونق سے صرف محبت اور وفاداری کا تقاضہ کیا، جس کا اس نے حق ادا کیا۔ اس نے بھی اپنی آدھی ادھوری، تشنہ، مضطرب زندگی کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کرلیا۔ جب وہ رونق کو ہنسی ہنسی میں کہتی تھی کہ ''بن پھیرے ہم تیرے'' تو اسکی بات نشتر کی طرح رونق کو چبھتی تھی۔ اس نے کئی بار اس سے کہا۔

''تو تمہاری خاطر میں سب کو چھوڑ سکتا ہوں تم بس ایک بار ہاں کہہ دو۔''

اور ہر بار اس کا ایک ہی جواب ہوتا:

''کسی کا نشیمن جلا کر میں اپنا آشیانہ نہیں بنا سکتی۔ باپ کے ہوتے بچوں کو کیسے یتیم کردوں؟

''اور تمہاری زندگی؟'' وہ تڑپ کر پوچھتا۔

''مجھے مانگے کے رشتوں سے گزارا کرنا آتا ہے۔'' وہ مسکرا کر جواب دیتی۔ ایک عورت کی زندگی میں باپ، بھائی شوہر اور پھر بیٹا یہ سب مرد اہم کردار نبھاتے ہیں اور اس کی زندگی میں باپ کے علاوہ سب رشتے تو ادھار کے تھے۔

وہ اسے اکثر کہتا۔

''میں تمہیں مکمل عورت بننے کا حق دینا چاہتا ہوں۔ تم شادی کے لیے ہاں کردو۔''

''تمہاری اولاد میری بھی تو اولاد ہے۔''

''بالکل نہیں۔ وہ منگیتا کی اولاد ہے، تمہاری نہیں۔''

''تم تو میرے ہو نہ؟''

''سر سے پیر تک تمہارا۔ صرف تمہارا۔ یہ جنم کیا اگلے جتنے جنم سب تمہارے نام۔''

''ایک شرط پر اگلے جنم کا وعدہ کروں گی۔''

''وہ کیا؟''

''مجھے تم مکمل چاہیے، آدھے ادھورے نہیں۔''

وہ کھینچ کر اسے سینے سے لگا لیتا۔

دل کی گہرائیوں سے رونق کو اس نے چاہا تو اس کے بدلے میں بے پناہ محبت سے رونق نے اس کی زندگی میں رنگ بھر دیے۔ اسے زندگی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ تھا اس کے پاس۔

پھر دھیرے دھیرے رونق کی ذمہ داریوں

اور عمر کے اس فرق نے رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ دلوں میں رفاقتیں قائم رہیں مگر نظروں کے فاصلے بڑھنے لگے۔ جب بیٹا جوان ہوتا ہے تو ماں کی ساکھ بھی مضبوط ہو جاتی ہے۔ بیٹے کی جوانی باپ کے بڑھاپے پر حاوی ہوتی گئی اور بیوی کی پکڑ مضبوط سے مضبوط ہو گئی۔ تیزی سے بدلتے حالات دیکھ وہ سمجھ گئی تھی کہ بہار کا موسم رخصت ہو چکا ہے اب مستقل طور پر خزاں نے اپنے قدم رکھ لیے ہیں۔ زخمی پرندے کی طرح وہ کراہی، چیخی، چلائی، پھڑ پھڑائی بھی پھر وقت نے حالات کے آگے گھٹنے ٹیکنے کو مجبور کر دیا۔ اس نے جب بھی گلہ شکوہ کرنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو رونق نے جھنجھلا کر اپنی مجبوریوں کا رونا سنا کر اس کی زبان بند کر دی۔ جب انسان اندر سے ٹوٹ جاتا ہے تو خاموشی اس کے وجود سے لپٹ جاتی ہے۔ اسے بھی چپ سی لگ گئی تھی۔ جو اس کی خاموشی پڑھ لیتا تھا اب وہ زبان سے کہی بات بھی سمجھ کرنا سمجھ بن گیا۔ شکوے شکایت لڑائی جھگڑے انسان اسی سے کرتا ہے جس پر وہ اپنا حق سمجھتا ہے جس سے کوئی توقع ہوتی ہے۔ دھیرے دھیرے شکوے شکایت کی رسم بھی ختم ہو گئی۔ خاموشیاں بڑھنے لگیں تو رشتوں کی گرماہٹ کی جگہ سرد مہری نے لے لی۔ فاصلے بڑھتے گئے۔ وہ اس موڑ پر تنہا کھڑی اس کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگی اور وہ اپنی گھر گرہستی میں ایسا الجھا کہ وہ بھول گیا کہ کوئی اس کا منتظر ہے۔ گاہے بگاہے وہ اسے آواز دے کر اپنی موجودگی کا احساس دلا دیتا۔ تعلق کی مہین سی ایک ڈور ابھی دونوں میں بندھی تھی۔ اس کے اندر دہکتی آگ دھیرے دھیرے بجھ کر راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی۔

پندرہ روز پہلے رونق نے فون پر بتایا تھا کہ کچھ دنوں سے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ سارے ٹیسٹ کروائے ہیں اور جلد ہی دل کی سرجری کرانی ہوگی۔ یہ سن کر وہ تڑپ اٹھی تھی۔

''کب جاؤ گے اسپتال؟''

''ایک دو روز میں ڈاکٹر سرجری کی تاریخ دیں گے۔''

''کس اسپتال سے آپریشن کرانا ہے؟''

''سب تفصیل بتا کر جاؤں گا۔ مگر.....''

''مگر کیا؟''

''اسپتال آنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کیوں؟ کیا میں تمہارا حال پوچھنے نہیں آسکتی؟'' اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''میں تمہیں فون کر کے حال بتاتا رہوں گا۔ تمہیں دیکھ کر خواہ مخواہ وہ اور پریشان ہو جائے گی۔'' اس نے جھنجھلا کر کہا۔

''اوہ۔وہ پریشان ہو جائے گی اور میں.....؟''
نہ چاہتے ہوئے بھی آواز بھرا ئی تھی۔
''یہ رد کر اور پریشان مت کرو انو رادھا۔ سمجھا کرو یار۔ گھر میں اگر پتھر بھی کئی سالوں سے ایک جگہ پڑا رہے تو اس سے بھی لگاؤ ہو جاتا ہے پھر وہ تو میرے بچوں کی ماں ہے۔''
''میرے بچوں کی ماں۔'' اس کے یہ الفاظ تیر کی طرح اسے لگے تھے۔ خاموشی سے اس نے فون بند کر دیا تھا۔ انو سے پھر وہ انو رادھا بن گئی تھی۔
چار پانچ روز بعد رفیق نے فون پر بتایا کہ ''آج اسپتال ایڈمٹ ہونے جا رہا ہوں۔ دیکھتے ہیں سرجری کب ہوتی ہے۔ میں تمہیں واٹس اپ پر بتاتا رہوں گا۔ موقع دیکھ کر فون کروں گا۔ تم فکر مت کرنا۔ اپنا خیال رکھنا۔''
''جلدی سے ٹھیک ہو کر آؤ، میں انتظار کروں گی۔''
''بہت دنوں سے ہم مل نہیں پائے، بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے۔ اسپتال سے آ کر ملوں گا۔''
''تمہارے ٹھیک ہو کر جلدی لوٹنے کی دعا کروں گی۔ رابطے میں رہنا۔ تم جانتے ہو مجھے چین نہیں ملے گا۔''
دو دن تو معمول کی طرح صبح بخیر کے میسج آتے رہے پھر تیسرے دن میسج آیا:
''آج آپریشن ہے، نو میسج۔ آپریشن کے بعد I.C.U میں رہوں گا۔ آ کر خود میسج کروں گا۔''
دعاؤں کے سوا اس کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ چاہ کر بھی فون کر کے کس سے اس کا حال پوچھتی۔ دل میں ہوک اٹھتی وہ فون اٹھا لیتی مگر دوسرے ہی پل خود کو روک لیتی۔ اس کے فون اور میسج کا بے قراری سے انتظار کرتی رہی۔ چار دن اور کشمکش اور انتظار میں گزر گئے۔
پہلی بار اسے اپنی مجبوری، لاچاری کا احساس شدت سے ہوا۔ اُڑان بھرنے کو اس کے پاس پر تو تھے مگر پرواز کی اجازت نہیں تھی۔ پنجرے میں قید پرندوں کی طرح پھڑ پھڑاتی رہی پھر نڈھال ہو کر رہائی کے حکم کا انتظار کرنے لگی۔ واٹس اپ پر اسے لاسٹ سین دیکھ کر پتا چل جاتا کہ وہ آپریشن کے بعد سے I.C.U سے باہر نہیں آیا۔
اس صبح میسج بھیجتے وقت اسے راحت محسوس ہوئی تھی جب اس نے دیکھا کہ لاسٹ سین کا وقت بدل چکا ہے۔ اس کی صحت یابی کی بھیجی دعائیں وہ پڑھ چکا تھا۔ مگر جواب کوئی نہیں آیا تھا۔ اس پل کے بعد سے فون کا انتظار شروع ہو گیا۔ ایک دن دو دن، تین دن گزر گئے، فون نہیں آیا۔ سارا دن وہ خود کو

مختلف کاموں میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتی پھر بھی ذہن اسی کی طرف بھاگتا۔ بے بسی نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ بات بات پر غصہ آنے لگا تھا۔ جی تو چاہتا تھا ایک بار اس کے گھر فون کر کے پوچھ لے پھر دوسرے ہی پل رونق کی ناراضگی سے ڈر جاتی۔ چوتھے دن دوپہر کے وقت ایک پرانی دوست کا فون آیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد اس نے پوچھا۔

''تم نے کچھ سنا؟''

''کیا؟''

اس طرف سے فوراً جواب نہیں آیا تو اس کے دل میں وسوسے اٹھنے لگے۔

''میں نے تو ابھی واٹس اپ پر پڑھا۔''

''کیا پڑھا؟ بتاؤ تو؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''رونق کے بیٹے کا میسج آیا ہے کہ رونق اس دنیا میں نہیں رہا۔''

یہ سنتے ہی اس کا جسم بالکل ٹھنڈا پڑ گیا جیسے ایک دم کسی نے اس کے پورے بدن کا خون نچوڑ لیا ہو۔ ادھر سے ہیلو ہیلو کی آواز اس کے گوش سے ٹکراتی رہی اور اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ کوئی جواب دے سکے۔ دماغ من جسم شل، ہاتھ پیر پھول گئے۔ ایک ہی سوال وہ خود سے دوہرا رہی تھی ''بنا ملے بنا کچھ کہے وہ اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے؟'' اس طرح وہ چلا جائے گا یہ تو اس نے سوچا نہ تھا۔ اس کی چھٹی حس تو بہت تیز تھی وہ اسے کیسے دغا دے گئی؟ ایک طوفان اس کی طرف رواں تھا اور اسے بھنک بھی نہ پڑی؟ تذبذب کی کیفیت سے سنبھلی تو جی نے چاہا کہ کہیں دور بھاگ جائے یا ایسی جگہ چھپ جائے جہاں کوئی اسے ڈھونڈھنے نہ آ سکے۔ مگر انسان کے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ غم ہو یا خوشی برداشت تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

وہ رات اس نے جاگ کر انگاروں پر کاٹی۔ کوئی نہیں تھا اس کے پاس جو دو بول تسلی کے بول کر اسے دلاسہ دیتا۔ گھر کے در و دیوار اس کے غمگسار تھے، اشکوں میں بھیگی رات دھیرے دھیرے سرکنے لگی۔ رونق کے ساتھ گزارے ماہ و سال اس کے دل و دماغ پر چوٹ کرتے رہے۔

صبح گیارہ بجے رونق کو سپرد آتش کیا جانا تھا۔ اس کے بیٹے نے موبائل پر اسے میسج بھیج دیا تھا۔ دل نے چاہا تھا کہ آخری بار اس کی صورت دیکھ لے، مگر ہمت جواب دے گئی۔ وہ اسے رخصت ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ نہ ہی اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ اپنی آنکھوں سے اس کے وجود کو مٹتا دیکھے اور نہ ہی وہ لوگوں کو اپنا چہرہ پڑھنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ پو پھٹتے ہی وہ شہر سے نکل گئی۔ سارا دن اس نے اولڈ ایج ہوم میں بزرگوں کے

ساتھ گزارا۔ جسمانی طور پر وہ ان لوگوں کے ساتھ تھی مگر ذہن کی اُڑان اس کے بس میں کہاں تھی۔ پرندے جتنی مرضی اونچی اڑان بھر لیں تھک ہار کر وہ اپنے گھونسلے میں ہی لوٹتے ہیں۔ دیر رات وہ بھی تھک ہار کر واپس اپنے خاموش، تنہا ویران آشیانے میں اپنا بوسیدہ بوجھ اٹھائے لوٹ آئی تھی۔

بہت سے سوال دن رات اسے پریشان کر رہے تھے۔ ان کا جواب تلاش کرنے، دل سے مجبور وہ رونق کے گھر ماتم پرسی کے لیے پہنچ گئی۔ صفِ ماتم پر میگھنا کے ساتھ اس کی بیٹی اور کچھ قریبی رشتے دار بھی موجود تھے۔ اس نے افسوس ظاہر کرنے کے بعد صرف اتنا ہی پوچھا کہ سرجری ہوئی تھی یا ابھی ہوئی تھی؟

میگھنا نے ایک ہی سانس میں نہ جانے کتنی کہانیاں سنا ڈالیں۔ کبھی کبھی انسان صدمے کی وجہ سے بالکل خاموش ہو جاتا ہے تو کبھی کچھ زیادہ بولنے لگتے ہیں کہ انہیں پتہ نہیں چلتا وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میگھنا بولے چلے جا رہی تھی اور سب خاموشی سے اُسے سُن رہے تھے۔ اس نے بتایا:

"آپریشن بالکل ٹھیک ہوا۔ I.C.U سے باہر آگئے۔ دوستوں کو میسج بھی کیا کہ میں ٹھیک ہوں۔ میرے منع کرنے کے باوجود چند قریبی دوستوں سے فون پر بات بھی کی۔ صبح چھٹی ہو جانی تھی۔ شام کو مجھے گھر جانے کو کہا کہ کمرہ ٹھیک کروا دینا۔ میں گھر جا کر آرام کرنا چاہوں گا زیادہ لوگوں سے ملوں گا نہیں۔ صبح مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ ناشتہ بھی کیا پھر اچانک انہیں بے چینی سی محسوس ہوئی۔ اسی وقت ڈاکٹر کو بلایا۔ جب تک ڈاکٹر آیا انہوں نے میرے بازوؤں میں آخری ہچکی لی اور گردن لڑھک گئی۔ اسپتال میں ہی ڈاکٹروں کے سامنے دیکھتے دیکھتے سب ختم ہو گیا۔" یہ کہہ کر وہ سسکنے لگی۔ اس نے حوصلہ دیا۔ بیٹی پانی لے آئی۔

کچھ پل خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ گویا ہوئی:

"کچھ عرصے سے بہت بدل گئے تھے۔ بہت خیال رکھنے لگے تھے میرا۔ ضد کرتے تھے کہ کھانا بنا لو ایک ساتھ ہی کھائیں گے۔ اسپتال میں آکر تو ضد اور بھی بڑھ گئی تھی۔ چائے پینے سے پہلے کہتے "پہلے تم پی لو میں اسی میں بعد میں پیوں گا۔ ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھا لیتے ہیں۔ تم میرے پاس ہی بیٹھو مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔" مجھے اپنے سے دور بالکل نہیں جانے دیتے تھے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "میگھو یہ حقیقت ہے کہ ایک نہ ایک دن تو سب کو جانا ہے مگر میں رب سے ہمیشہ یہ دعا کرتا ہوں پہلے وہ مجھے بلا لے۔ میں تمہارے بن زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔"

میں نے کہا: ''بڑے خود غرض ہو جی صرف اپنی سوچتے ہو۔ میں بھلا آپ کے بنا کیسے رہ پاؤں گی۔''

کہنے لگے: ''کیا ہی اچھا ہو اگر ہم دونوں ایک ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جائیں۔''

میں نے کہا: ''ایسا بھلا ہوتا ہے کبھی؟''

بولے: ''سڑک حادثہ بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''دیکھو بھلا ان کی تو مراد پوری ہو گئی اور میں پیچھے رہ گئی اکیلی۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

پاس بیٹھی بہن نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا: ''تو خود کو اکیلی کیوں کہتی ہے۔ اکیلے ہوں تیرے دشمن۔ بھرا پورا پریوار چھوڑ کر گئے ہیں بھائی صاحب۔ رب تیری اولاد کو سلامت رکھے۔ ابھی تو تمہیں ان کی خوشیاں دیکھنی ہیں۔''

پاس بیٹھی بیٹی بولی۔ ''پاپا تو آج کل ماں کا ایسے خیال رکھتے تھے جیسے نئی دلہن ہو۔ اس روز بازار سے خود ہی دو جوڑے ان کے لیے لے کر آئے اور بولے، ایسے کھلے کھلے رنگ پہنا کرو مجھے یہ پھیکے رنگ بالکل پسند نہیں۔''

کبھی کبھی کچھ باتیں اندر تک زخمی کر دیتی ہیں مگر کبھی کبھی ان کہی باتیں انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ وہ بھی سر جھکائے سب باتیں خاموشی سے سنتی رہی پھر اٹھنے سے پہلے اک نظر رونق کی تصویر پر ڈالی جس پر تازہ پھولوں کا ہار لٹک رہا تھا اور اس کی مخصوص مسکراہٹ اسے بے چین کر گئی۔

گھر جانے کی بجائے اس نے گاڑی کا رخ سمندر کی طرف موڑ لیا۔ میگھنا کی کہی ان کہی باتیں اس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ دل پر نشتر چلاتی رہیں۔ مچلتی لہروں کو ساحل سے سر ٹکراتے واپس لوٹتے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح وہ اسے اپنی جیسی لگیں۔ لہروں کا تلاطم اور اس کے اندر کے طوفان میں کوئی فرق نہ تھا۔ ننگے پاؤں وہ سمندر کی طرف بڑھ گئی۔ خود سے وہ سوال کر رہی تھی کہ جس کے نام اس نے اپنی ساری زندگی کر دی، وہ اس کا کیا تھا؟ رونق کی زندگی میں اس کا کیا مقام تھا؟ کیا سچ مچ وہ سب رونق نے میگھنا کو کہا ہوگا؟ اگر ہاں تو جو ساری عمر اس سے کہتا آیا جنم جنم کا ساتھ نبھانے کا وعدہ وہ سب فریب تھا؟ کیا میگھنا اسے جلانے کے لیے یہ سب کہہ رہی ہے؟

انہی سوالوں میں الجھی وہ خود کلامی کرنے لگی: ''بدل تو وہ گیا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ شوخ رنگ اسے پسند تھے۔ کیا اس نے ضروری نہیں سمجھا کہ آپریشن کے بعد ایک فون یا میسج مجھے بھی کر دیتا؟ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ میں بھی پریشان ہوں گی۔ میگھنا کے پاس تو اس کی اولاد ہے مگر میرے پاس کیا ہے؟

میرے پاس تو صرف وہ ہی تھا۔“
سمندر کی تیز لہریں اس رفتار سے بل کھاتی لہراتی ساحل سے ٹکرا رہی تھیں اور وہ اپنے وجود اپنے آپ کو خود میں تلاش کرتے یادوں کے طوفان سے لڑ رہی تھی۔ اتنے دنوں سے وہ جس کا ماتم کر رہی تھی، آج اسے لگا وہ تو اسکا تھا ہی نہیں وہ تو کسی اور کا تھا۔ ساری عمر وہ پرچھائیں کے پیچھے بھاگتی رہی۔ اس پرچھائیں کی اوٹ میں سکون تلاش کرتی رہی۔ پرچھائیں لمبی ہو جاتی تو کبھی چھوٹی اور وہ اس کی اوٹ میں سمانے کے لیے اپنا وجود اس کے حساب سے سمیٹ لیتی۔
آج اس پرچھائی کا سایہ بھی چھن گیا۔ بنا سائبان کے اس کو اپنا وجود کڑی دھوپ میں ننگے سر صحراؤں میں سلگتا، جھلستا محسوس ہوا۔ اس تپش سے نجات پانے کے لیے اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر کے دور سے آتی لہروں کے حوالے کر دیا۔ شور مچاتی لہریں آئیں اس سے ٹکرائیں، وہ لڑکھڑا کر گری اور لہریں اپنے ساتھ سمندر میں بہا لے گئیں۔ آنکھیں موندے پر سکون آخری سانس کے اکھڑنے کی منتظر تھی کہ دوبارہ سے تیز آتی لہروں نے اسے واپس ساحل کی طرف دھکیل دیا اور اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اسے کھینچ کر ریت پر پٹخ دیا ہو۔
یک دم اس نے آنکھیں کھول دیں اپنے چاروں طرف دیکھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ ہلکی چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور وہ اس جانے پہچانے لمس کی خوشبو اپنی رگوں میں سرایت کرتی محسوس کرنے لگی۔ رونق کی مخصوص مسکراہٹ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔ وہ اس کی مسکراہٹ، اس کی آنکھوں میں کھو کر سب بھول جانا چاہتی تھی۔ ان آنکھوں میں ڈوب کر اپنے اندر کلبلاتے سوالوں کے جواب تلاش کرنا چاہتی تھی۔ شاید ان سوالوں کے جواب وقت کے پاس ہوں یا پھر تا عمر وہ ان کی تلاش میں بھٹکتی رہے مگر ایک بات کی گواہی اس کا دل بڑے وثوق سے دے رہا تھا کہ رونق مجبور تو ہو سکتا ہے بے وفا ہرگز نہیں اور اس کے جینے کے لیے دل کی یہ دلیل ہی کافی تھی۔
ہلکی چاندنی نے رات کی تاریکی کو کم کر دیا تھا۔ بالکل اس کی زندگی کی طرح۔ کچھ عیاں تھا کچھ نہاں۔ لہریں اسی رفتار سے شور مچاتی ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ نرم ٹھنڈی ہوا اس کے جسم میں سرسراہٹ پیدا کر گئی۔ اپنے بکھرے وجود کو پھر سے سمیٹ کر وہ زندگی کی جانب مڑ گئی۔

☆☆☆☆☆

''خشک پتے''

اعلیٰ عہدے کی ملازمت کے انٹرویو میں امیدوار سے پوچھے گئے سوال کے جواب نے کمرہ امتحان میں بیٹھے سبھی ممتحن کو حیرت میں ڈال دیا۔

''ماں باپ میں سے کون زیادہ لائق محبت ہے آپ کے نقطہ نظر کے مطابق کس کا درجہ بڑا ہونا چاہیے؟ ماں یا باپ؟'' ممتحن نے ایک عام سا سوال کر کے امیدوار کو ریلیکس کرنا چاہا۔ وہ کچھ دیر توقف کے بعد بولا'' وہ جوان میں سے اپنی اولاد کے لیے سب سے زیادہ قربانی دے۔ میرے نزدیک باپ'' اب تک کے بیسیوں امیدواروں سے ایک ہی سوال کے یکساں نوعیت کے جواب سننے کے بعد اس جواب نے جیسے سب کو چونکا دیا تھا۔

''لیکن کیا آپ نہیں جانتے کہ ماں ایک عورت ہونے کے ناتے اپنی اولاد کے لیے کیا کیا کچھ برداشت کرتی ہے؟'' توقع کے برعکس جواب سن کر ایک ممتحن نے پہلو بدل کر پوچھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

''ممکن ہے آپ کے خیال میں ایسا ہو۔ لیکن میں محبت کو مختلف اصناف کے خانوں میں نہیں بانٹتا۔ وہی لائق محبت ہے جو اس کے معیار پر پورا اترے۔ جذبوں کی تقسیم اصناف کی بنیاد پر نہیں بلکہ انسانوں کی خاصیت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔''

انٹرویو دے کر باہر نکلا تو سکرین پر ایک نہایت مانوس نمبر جگمگا تا دیکھ کر مسکرایا۔

''جی ہو گیا انٹرویو۔۔ ہاں لیکن ہمیں چونکہ روایت سے ہٹ کر کوئی بات سننے کی عادت نہیں لہٰذا میرے ایسے لوگ رد کر دیے جائیں گے'' مقابل نے ایک حوصلہ افزا قہقہہ لگایا۔

''تمھیں بھی تو گھر چین نہیں آتا۔ گھر آؤ دیکھو تمہارے لیے ایک مزے کی ڈش بنائی ہے۔ امید ہے تمہیں پسند آئے گی'' کھانے کی پیشکش سن کر اس کی ساری تھکن اتر گئی۔ گاڑی ڈرائیو کرتے اس کی نظریں سکرین سے پار تھیں لیکن دماغ بدستور کئی سال پیچھے کی جانب سفر کر رہا تھا۔ ماضی کی گرد تلے دبی ایک پرانی یاد دماغ کے پردے پر دستک دینے لگی۔

خشک پتوں پر ہونے والی سائیکل کے ٹائروں کی چرچراہٹ پر عالیشان گھر کے سامنے بیٹھے چوکیدار نے ناگواری سے پلٹ کر دیکھا۔ لانگ نیکر شرٹ میں ملبوس آٹھ سالہ بچہ دو پہیوں والی چھوٹی سی سائیکل کو شیشم کے درخت کے سہارے کھڑا کر کے اب دونوں گھٹنوں پر جھک کر اوپری منزل کی طرف دیکھ رہا تھا، یوں جیسے چاند رات کو بچے چھت پر چڑھ کر چاند کو

عروج راؤ

تلاشتے ہیں۔ یا جیسے بستی میں نو وارد اجنبی کے لیے بے تاب ہوتے ہیں۔ زیادہ نہیں محض ایک جھلک دیکھنے کے لیے۔۔

"اوئے لڑکے تمہیں کتنی بار سمجھاؤں؟ یہاں مت آیا کرو۔ صاب ناراض ہوتے ہیں" چوکیدار کی تیوری پر یوں بل پڑے تھے جیسے گھڑے سے نکلے کپڑے میں پڑے ہوتے ہیں۔ آنے والے نے اس تنبیہ پر ہمیشہ کی طرح چوکیدار کو یوں نظرانداز کیا جیسے وہ اس منظر کا حصہ ہی نہ ہو۔ نظریں بدستور اوپری منزل کی بالکنی پر جمی تھیں۔ وہ یوں نگاہیں جمائے کھڑا تھا جیسے پلک جھپکنے پر اس کا ارتکاز یا وہ منظر ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ چوکیدار کے گھورنے اور تاڑنے پر بھی وہ جوں کا توں کھڑا رہا۔ کہ اسی وقت مین گیٹ کھلا اور ایک سیاہ گاڑی نمودار ہوئی۔ اس تک پہنچ کر گاڑی کے شیشے نیچے ہوئے، وہ اب بالکنی چھوڑ کر سیاہ شیشوں کو دیکھنے لگا۔ شیشہ جونہی نیچے ہوا تو ایک پختہ عمر کے آدمی کا تیوری چڑھا چہرہ نمودار ہوا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کا کان سختی سے کھینچا "تمہیں ایک بار کی بات سمجھ نہیں آتی؟ کتنی بار کہوں کہ یہاں مت آیا کرو۔ آئندہ اگر تم یہاں نظر آئے تو یاد رکھنا تمھارا باپ اپنی اولاد سے محروم ہو سکتا ہے۔" وہ تکلیف سے سرخ ہوتا کان چھڑا کر تیزی سے اپنی سائیکل کی طرف بھاگا اور سوار ہو کر اسی سڑک کی جانب ہولیا جہاں سے آیا تھا۔

مہنگی ساڑھی میں ملبوس، تک سک سے تیار بالکنی میں کھڑی پینتیس سالہ عورت نے ایک پل کو اس کی جانب دیکھا پھر نخوت سے منہ موڑ لیا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ اپنے بددماغ شوہر مسٹر حیات کے ہاتھوں اسے یوں روز روز ذلیل ہوتا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

شیراز حسن کچلے جذبات، شکستہ دل اور سرخ چہرہ لیے اپنی سائیکل سمیت چلا گیا اور پیچھے سوکھے پتوں کی چرمراہٹ چھوڑ گیا۔

دو منزلہ چھوٹے سے گھر کے سامنے پہنچ کر، سائیکل ایک طرف پھینکتا تیزی سے زینہ پھلانگتا اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے آنسوؤں سے تر چہرہ کوئی دیکھے تو سوال کرے۔ وہ تو بس اپنے کمرے کے کسی تاریک گوشے میں بیٹھ کر رونا چاہتا تھا۔ اتنا کہ جتنا وہ چار سال پہلے رویا تھا۔ نمی اس کی آنکھوں کے کواڑوں پر بسیرا کرنے لگی۔ وہ سر جھکائے ایک ایک کر کے ماضی کے دھندلکوں سے پرے جھانکنے لگا۔ دل کو مضطرب دیکھ کر دماغ کھینچ کر وہ منظر سامنے لے آیا تھا جو اس کی آٹھ سالہ زندگی کا سب سے اذیت ناک منظر تھا۔

''بیٹا آپ بتائیے کہ آپ کس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں؟'' کمرہ عدالت میں کھڑے وکیل نے اسے پچکارا۔ اس نے ایک بار اپنے جان سے پیارے باپ کی طرف دیکھا اور پھر دوسری طرف کھڑی ماں کی طرف۔ کس کو چھوڑے؟ کس کو رکھے؟ ننھا

ذہن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ کس قدر مشکل فیصلہ تھا۔ وہ رو ہی تو دیا۔

وکیل کے دوبارہ پوچھنے پر اس نے پہلے ماں کی طرف دیکھا پھر باپ کی طرف۔۔۔ پھر ایک ہاتھ ماں کی طرف اور دوسرا ہاتھ باپ کی طرف اٹھا دیا۔

''ان دونوں کے ساتھ'' وکیل نے ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''دیکھو بیٹا تمھیں ان دونوں میں سے کسی ایک کو چننا ہوگا'' وکیل نے اپنی بات دہرائی۔ اس کا ننھا ذہن کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ کچھ دیر ناسمجھی سے دونوں کو دیکھتا رہا۔

''اگر ماما چلی گئیں تو رات کو جب۔۔۔ جب میں ڈر کے اٹھوں گا تو۔۔ تو پھر مجھے کون اپنے ساتھ لگا کر سلائے گا؟ انکل مجھے رات کو ڈر لگتا ہے'' وہ محبت کے مفہوم و فلسفے سے واقف نہیں تھا۔ لیکن بقدر مشاہدہ و تجربہ اس لمس کی تشریح ضرور کر سکتا تھا۔

''یعنی آپ اپنے بابا کے ساتھ نہیں جانا چاہتے؟'' وکیل کے سوال کرنے پر اس نے حیرت سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔

''لیکن جب میں باہر کھیلتے ہوئے گر جاتا ہوں تو بابا ہی مجھے اٹھاتے اور پیار کرتے ہیں۔ اور جب۔۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بھولپن سے کہا ''جب بہت زیادہ بارش ہوتی ہے اور ہماری گلی میں پانی جمع ہو جاتا ہے اور مجھے سکول جانا ہوتا ہے۔ تب بابا مجھے اپنے کاندھوں پر بٹھا کر لے جاتے ہیں۔'' وہ صاف صاف نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ اپنے باپ کی مضبوط پناہ گاہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

جب فیصلہ ہوا تو اسے اندازہ ہوا کہ وکیل نے اس سے محض رسماً پوچھا تھا۔ اور جب اس کی ماں اس سے ہاتھ چھڑا کر احاطہ عدالت سے باہر نکل رہی تھی تب وہ لپک لپک اپنی ماں کی طرف جاتا تھا۔

''ماما مجھے چھوڑ کر مت جائیے۔ مجھے اندھیرے سے خوف آتا ہے۔ میں رات کو کیسے سو پاؤں گا'' ایک ہاتھ میں باپ کی شرٹ کا کونا پکڑے اور دوسرے ہاتھ میں ماں کا پلو پکڑے وہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ لیکن کوئی نہیں سن رہا تھا۔ عدالت میں ایسی چیخ و پکار تو روز کا معمول تھی۔ کوئی گھر اجڑنے پر چیختا تو کوئی زندگی بکھرنے پر۔ یہاں آنے والے لوگ اپنے جذبات، لحاظ اور ان سے بندھے رشتے باہر چھوڑ کر آتے ہیں۔ وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اور سمجھ رہا تھا کہ آسمان اس کے ساتھ رو رہا تھا۔ بھلا رونے والوں کے ساتھ کون روتا ہے؟

پھر اس کی نانی نے سختی سے اس کے ہاتھ سے اس کی ماں کا پلو چھڑایا اور اس کے باپ کی طرف دیکھ کر گویا ہوئی ''سنبھالو اپنی اولاد کو۔ میں اپنی بیٹی کے مستقبل پر اس کا سایہ تک برداشت نہیں کروں گی۔ رکھو اسے اپنے پاس تاکہ تمھیں پتہ چلے کہ بچے کیسے پالے جاتے ہیں'' زمین پر بیٹھ کر ہچکیاں

کیفیت میں چیختے ہوئے اپنی ماں کو خود سے دور جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

جذبات کی عینک کو اتار کر ذرا حقیقت کا چشمہ لگا کر دیکھیں تو یہ سمجھ آتا ہے کہ انسان، ماں باپ ہونے کے علاوہ ایک عام انسان ہوتے ہیں جن میں عام انسانوں والی خوبیاں وخامیاں دونوں ہوسکتی ہیں۔ اگر وہ مخلص ہوسکتے ہیں تو منافق بھی ہوسکتے ہیں۔ اگر وہ بے غرض ہوسکتے ہیں تو لالچی بھی ہوسکتے ہیں۔ لیکن ہم ٹھہرے بلا کے روایت پسند۔۔ جسے ایک بار ایک مسند پر بٹھا دیا اس کی ہر خامی پر آنکھیں میچ لیں۔ یوں یہ اندھا پن ہماری نسلوں میں سرایت کرتا جاتا ہے۔

یہ عقدہ بھی شیراز حسن پر جلد ہی کھل گیا کہ اس دن کے بعد وہ جس عورت سے ملنے جاتا تھا وہ اس کی ماں نہیں مسز حیات تھی۔

وہ اور فیض حسن اس گھر میں اکیلے رہ گئے تھے۔ باوجود معاشی ذمہ داریوں کے فیض حسن نے اسے پالا۔ کھانا بنانے سے کھلانے، کپڑے دھونے سے پہنانے اور گھر کی صفائی ستھرائی کے سارے کام وہ خود انجام دیا کرتا تھا۔ اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے۔

وہ اپنے باپ کو گھر کے کام کرتے، نوکری سنبھالتے، اپنے ذاتی کام کرواتے، اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھتے، تنہائی میں بڑبڑاتے، کبھی بے وجہ کھویا ہوا کبھی شکن آلود پیشانی سے در و دیوار کو گھورتے ہوئے دیکھتا تو محسوس کیا کرتا کہ اس کا باپ اپنے اندر کتنی جنگیں لڑ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جس آئیڈیل عورت کے سگھڑاپے، ذہانت و محبت کی بات اس کا باپ اپنا بھرم رکھنے کو اپنے دوستوں کی محفل میں کیا کرتا تھا وہ عورت کس طرح ان کی زندگیوں کو ادھورا کر گئی تھی۔ ان کی علیحدگی ایسی خاموشی سے ہوئی تھی کہ فیض حسن کے دوستوں تک کو علم نہ ہوسکا۔ وہ جب بھی اپنی ماں کے متعلق سوال کرتا تھا تو اسے ایک ہی جواب ملتا۔

"تمہاری ماں بہت اچھی عورت تھی۔ درحقیقت وہ ایک عظیم عورت تھی۔ بس یوں سمجھو کہ اس کے لیے ہمارا گھر کچھ چھوٹا پڑ گیا تھا"

"میں جب بڑا ہو جاؤں گا۔ تو ویسا گھر خریدوں گا جیسا مسز حیات کا ہے۔ پھر میں انھیں واپس لے آؤں گا۔ ہم سب ایک ساتھ رہیں گے۔ ایک گھر میں۔ پھر تو وہ رہ لیں گی ناں ہمارے ساتھ؟" وہ معصومیت سے پوچھتا۔ حالات کچھ بھی رہے ہوں۔۔ اولاد بس والدین کو ساتھ دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا۔ عرصہ لگا اسے یہ سمجھنے میں کہ وہ ساتھ رہنے والوں کے لیے چھوٹے سے چھوٹے گھر بھی چھوٹے نہیں پڑتے بلکہ ظرف کا دامن تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ایسی چھوٹی چھوٹی خواہشات اپنی ڈائری میں لکھتا رہتا تھا۔ ہاں جس روز مسز حیات نے اسے دیکھ کر منہ موڑا تب اس نے ڈائری کا وہ صفحہ کھینچ کر پھاڑ

دیا جس پر ان کے ایک ساتھ رہنے کی تمنا رقم کی تھی۔

انسان تو خدا تک سے بدگمان ہو جاتا ہے وہ تو پھر اس کی ماں تھی۔

اس نے صرف کہا ہی نہیں۔ بلکہ جو کہا کر بھی دکھایا۔ ملازمت ترک کر کے آغاز چھوٹے سے کاروبار سے کیا۔ اور دن رات ایک کر کے جو کچھ ہاتھ آیا اس سے سب سے پہلے گھر بنایا۔ ویسا گھر جیسا کسی شخص کا خواب ہو سکتا تھا۔ وہ بڑا ہو گیا تھا۔ خوف سے لڑنا چھوڑ کر خود پر غلبہ پانا سیکھ گیا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ اس نے جذبات کو دماغ پر حاوی کرنے کی بجائے انھیں اپنے دماغ کا ایندھن بنایا تھا۔ اور نتیجہ اس کی کامیابی کی صورت میں نکلا تھا۔ یہ اصول اس نے اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ وہ جسے اس کے اندر کا انتشار توڑنے لگتا تو وہ اپنے بچے کھچے رشتوں کو جوڑنے لگتا تھا وہ جسے اندر کی وحشتیں و تنہائیاں ڈسنے لگتیں تو دوسروں کے لیے سامان راحت کرنے لگتا۔

اسے سب یاد رہا۔۔ ہاں وہ یہ بھول گیا کہ کبھی کسی بھٹکے مسافر کو اس کی منزل پر لانے کا وعدہ بھی کیا تھا، عین اسی طرح جیسے اس کی ماں عرصہ پہلے اسے بھول گئی تھی۔

سالہا سال بعد جب مسٹر حیات کے عالیشان گھر کے ایک گھٹن زدہ کمرے میں لیٹے ساٹھ سالہ بیمار خاتون نے کوئی سو ویں بار اپنے گرد نظر دوڑائی۔ وہ کب سے کسی کی آہٹوں پر کان دھرے بیٹھی تھی۔ اس کوشش میں کبھی تو کہنیوں کے بل اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کرتی تو کبھی واپس تکیے پر سر دھرے آنکھیں موندنے میں مصروف ہو جاتی۔ درختوں پر خزاں آن رکی تھی۔ اور زندگی پھر سے الٹے پاؤں چلنے لگی تھی۔ پیروں تلے آتے درختوں کے خشک پتوں کی چیخ و پکار اور وہ خاموش آنکھوں کی گریہ وزاری۔ پھر سے فلم بن کر اس کی آنکھوں میں پھرنے لگتا۔

کافی دیر تک اسی مشق کو دوہرانے کے بعد اس نے اپنے ملازم کو کوئی پانچویں آواز دی۔ تو ملازم نے بادل ناخواستہ اس کے کمرے میں جھانکا اور تیوری چڑھا کر کہا۔

''ابھی تو دوائیں دی ہیں۔ اور کیا چاہیے؟''

کمر جھکنے اور مالک کے نظریں پھیرنے کی دیر تھی کہ ملازم بھی مالک بن بیٹھے۔

''آج گھر میں خوب چہل پہل ہے۔ کوئی آ رہا ہے کیا؟'' بیمار نقاہت زدہ آواز ابھری

''جی۔ حیات ساب کی پہلی بیگم اپنے بچوں سمیت یہاں مستقل رہنے کے لیے آ رہی ہیں۔ سنا ہے بہت نازک مزاج ہیں۔ ذرا سا شور بھی ان کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ سو بار بار ٹوکنا مت کیجیے'' ذرا تنک کر بولا

''کیا کہا؟ حیات ساب کی پہلی بے۔۔ بیگم؟ اور بچے؟'' وہ یوں چڑ مر ہو کر بولی تھی جیسے خزاں رسیدہ خشک پتے کسی کے پاؤں تلے آ کر چرمراتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

غزل

کھلا مجھ پر درِ امکان رکھنا
مرے مولا ! مجھے حیران رکھنا

یہی اک مرحلہ منزل نہ ٹھہرے
یہی اک مرحلہ آسان رکھنا

مرے دل کا ورق نکلے نہ سادہ
کوئی خواہش، کوئی ارمان رکھنا

یہ دل طاقِ چراغِ زر نہ ٹھہرے
مرے مالک ! مجھے نادان رکھنا

مرے حالات مجھ کو چھو نہ پائیں
مجھے ہر حال میں انسان رکھنا

بھری رکھنا ، مرے مولا! یہ آنکھیں
دُکھوں کی بارشوں کا مان رکھنا

مرے ساتھی بھی مجھ سے بے نوا ہیں
بساطیں دیکھ کر تاوان رکھنا

یہ دن کیونکر چڑھا، وہ شب ڈھلی کیوں
مجھے آیا نہ اتنا دھیان رکھنا

مجھے بھی عام یا گمنام کر دے
کہ اِک آزار ہے پہچان رکھنا

اسیرِ عمر کو آیا نہ اب تک
کتابِ ہجر کا عنوان رکھنا

ہوا کی طرح صحرا سے گزر جا
سفر میں کیا سر و سامان رکھنا

خالد احمد

غزل

کل کے امکان پہ میں بات نہیں کر سکتا
دور اذکار خیالات نہیں کر سکتا

ہم وہاں جاتے ہیں جو ایک نظر کی خاطر
شخص اتنی بھی مدارات نہیں کر سکتا

اُس نے طوفان سمندر کے دبا رکھے ہیں
آسماں کیسا ہے برسات نہیں کر سکتا

اس کے درمان میں آزار سہے ہیں ہم نے
پیار کیوں پھر بھی وہ کم ذات نہیں کر سکتا

تیری بستی میں جو انظار کا پانی ہے پیا
اب میں جاتا ہوں یہاں رات نہیں کر سکتا

اشک جتنے تھے ترے ہاتھ میں ڈالے میں نے
اپنی آنکھوں کو توسوغات نہیں کر سکتا

میں نے تخفیف تو کر لی ہے تمناؤں میں
کم مگر شدتِ جذبات نہیں کر سکتا

اک عقیدہ ہے ازل سے جو ملا ہے ثاقبؔ
کم کبھی عزتِ سادات نہیں کر سکتا

آصف ثاقب

غزل

چار دن ساتھ گزارے ہیں تو اپنے لگے ہیں
مجھ کو اِس شہر میں کچھ لوگ سمجھنے لگے ہیں

رات محفل میں رکی تھی ذرا اِک رُخ پہ نظر
اور اب نقش مرے دل میں دھڑکنے لگے ہیں

اُس نے کچھ ایسے محبت سے اِدھر دیکھا ہے
ولولے دل کے قدم عرش پہ دھرنے لگے ہیں

ڈھانپ چہرے کو، بچا شیش محل دنیا کا
آئنے چار طرف دیکھ تڑخنے لگے ہیں

میرے حالات میں کیا موڑ ہے آنے والا
مرے احباب مجھے چھوڑ کے جانے لگے ہیں

کس کے بینگوں نے ہلا دی ہے مرے دل کی زمیں
جتنے مینار تھے پندار کے ڈہنے لگے ہیں

اُس کی نیت نہ سہی لفظ مگر ہیں ایسے
زخم بھرنے جو نہ پائے تھے اُدھڑنے لگے ہیں

ہے خبر اُس کی جو خود سے بھی چھپاتے ہیں حضور
وہ بھی معلوم ہے اب آپ جو کہنے لگے ہیں

کوئی قتلام ہوا ہے مرے اندر عالی
سُرخ آنسو مری آنکھوں سے برسنے لگے ہیں

جلیل عالی

غزل

اسی رخ دل رواں پایا گیا ہے
جدھر روشن سا اک سایا گیا ہے

اک اُس کی دُھن میں کیا کیا گُن سمیٹے
جو گیت اندر کہیں گایا گیا ہے

ترے بخشے ہوئے اک غم کے دَم سے
یہ دل کچھ اور گہرایا گیا ہے

کبھی اک بوند بجرائی گئی ہے
کبھی اک بحر قطرایا گیا ہے

سرِ صحرا اسے بھی پڑھ کے دیکھو
ہواؤں سے جو لکھوایا گیا ہے

دمکتا ہے برابر چاند اپنا
فقط خبروں میں گہنایا گیا ہے

سخن میں سوز ہے سارا اُسی سے
ہمیں جس ہجر فیضایا گیا ہے

دُھلی راتوں کی نوری شبنموں سے
گلِ احساس اُجلایا گیا ہے

بس اک سنگِ انا ٹوٹا نہ عالی
دروں جو جو تھا بُت ڈھایا گیا ہے

جلیل عالی

غزل

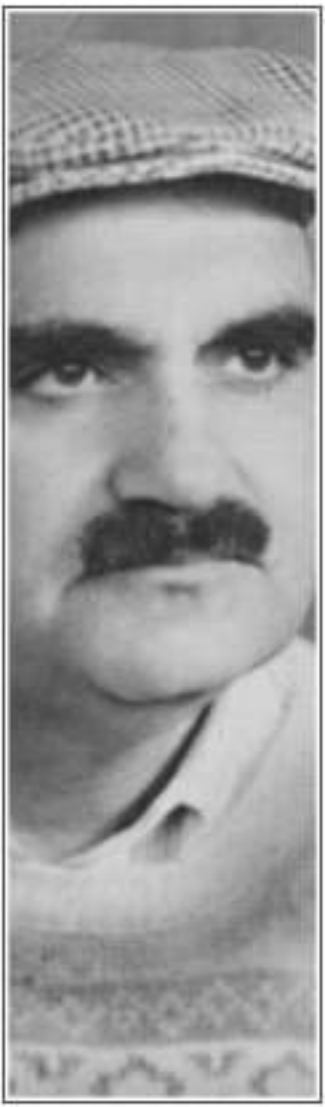

تہمتِ عشق کے الزام سے ہوکر گزری
ایک حسرت دل ناکام سے ہوکر گزری

شیشۂ دل سے لگی بیٹھی ہے آنسو کی جو بوند
تیری آنکھوں کے سیہ بام سے ہوکر گزری

کچھ نہیں بگڑا محبت کا اگرچہ سو بار
وادیٔ گردشِ ایام سے ہوکر گزری

آسماں میری عبادت پہ نہ کیوں رشک کرے
عرشِ اعظم کے در و بام سے ہوکر گزری

گردشِ وقت بھی چال اپنی بھلا بیٹھی ہے
کیا تری جادو بھری شام سے ہوکر گزری

وہ قیامت کی گھڑی جس کا گزرنا تھا محال
تیرے ہوتے ہوئے آرام سے ہوکر گزری

جمیل یوسف

غزل

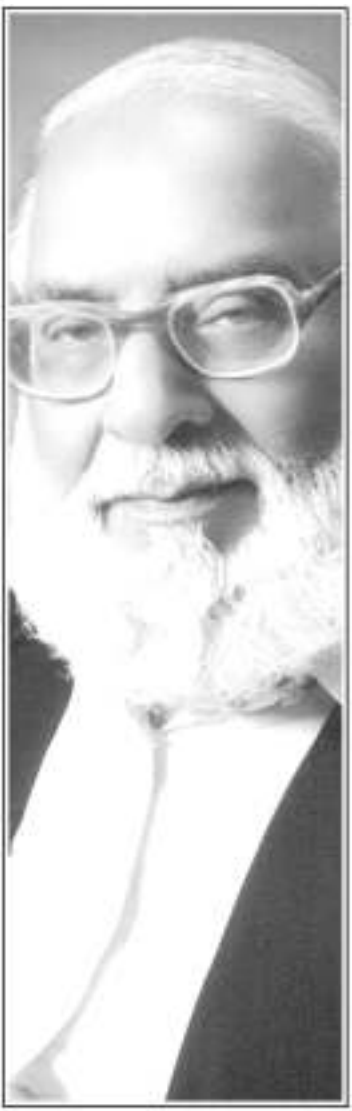

شاید غمِ حیات کی تلخی ہے کم ابھی
اُترا نہیں ہے آنکھ میں گریہ کا نم ابھی

اُمڈے ہوئے خیال ذرا اور ضبط کر
طولِ شبِ فراق کا تو دیکھ دَم ابھی

دریوزہ گر نہیں ہوں کسی دستِ غیر کا
جامِ سفال ہے یہ مجھے جامِ جم ابھی

دستارِ شہریار کا دم خم نہ کم ہوا
دیکھا غریبِ شہر کا ہے سَر تو خم ابھی

اب بھی خیالِ یار ہُنر آفرین ہے
حُسنِ تصوّرات ہے زرّیں رقم ابھی

اے بارگارِ ناز! ثمر آفرین ہو
ہیں منتظر کرم کے ترے دل سے ہم ابھی

ہر سُو مسافتوں کے ہیں مَسدُود راستے
بے حد و بے کنار ہے دشتِ الم ابھی

ہر خونچکاں خبر کا تسلسل مزید ہے
حالاتِ اشکبار میں ہیں بیش و کم ابھی

طوفانِ بے اماں کا ستم جس قدر سہی
دِل سے ریاضؔ ہو تو وہ جائے گا تھم ابھی

سید ریاض حسین زیدی

غزل

یوں مکمّل وضو ہوا میرا
جسم سارا لہُو ہوا میرا

وہ جو حاصل کبھی نہ ہو پایا
حاصلِ جستجو ہوا میرا

کون یاد آگیا مجھے یکدم!
دھیان بھی خوبرُو ہوا میرا

شہرتوں سے گریز تھا مجھ کو
تذکرہ کوبکو ہوا میرا

بڑھ گئی اَور چاک دامانی
پیرہن جب رفُو ہوا میرا

خواب میں آج میں نے یہ دیکھا
چھوڑ کے سب کو تُو ہوا میرا

آئنہ توڑنے کو جی چاہا
عکس بھی جب عدُو ہوا میرا

یوں لگا ہر خزاں کی رُت میں نسیمؔ
موسمِ رنگ و بُو ہوا میرا

نسیمِ سحر

غزل

سخنِ شیریں کی تائید کیے جاتے ہیں
ہم بھی فرہاد کی تقلید کیے جاتے ہیں

میری تحریر جنہیں باندھ کے رکھے ہُوئے ہے
وہ مِری ذات پہ تنقید کیے جاتے ہیں

اُن سے کچھ بابِ محبت میں ہے کہنا سو ہم
میر کے شعر کو تمہید کیے جاتے ہیں

جگنوؤں جیسی سہی روشنی اپنی لیکن
پھر بھی ہم رات کی تردید کیے جاتے ہیں

آنکھ جھپکانا نہیں ، چاہے ہَوا جیسی ہو
اے چراغو ! تمہیں تاکید کیے جاتے ہیں

آؤ بیٹھو، یہ فقیروں کا ٹھکانہ ہے، یہاں
ذرّۂ خاک بھی خورشید کیے جاتے ہیں

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

درد کا نشہ انگ انگ میں تھا
زندگی کا مزہ ترنگ میں تھا

غزلیں

بیچنے کے لیے کونسی تدبیر نکالیں
آتا ہے جگر ساتھ اگر تیر نکالیں

لازم ہے محبت ہی محبت کا صلہ ہو
کچھ اور نہ اس خواب کی تعبیر نکالیں

اخلاص کی بنیاد پہ جچتے ہیں مراسم
ذہنوں سے ذرا منصب و جاگیر نکالیں

لڑنا ہے ضروری کہ عدو سر پہ کھڑا ہے
کیا فائدہ گر بعد میں شمشیر نکالیں

انصاف یہی ہے جسے للکار دیا ہے
اس شخص کے پیروں سے بھی زنجیر نکالیں

اس شہر کے تفتیش کندوں پہ ہے آساں
زیتوں کی زنبیل سے انجیر نکالیں

ہر فصل یونہی ورنہ اُجڑتی ہی رہے گی
یاروں سے کہو کھیت سے خنزیر نکالیں

گلزارؔ ہیں جب سخت مراحل سے گریزاں
پھر گھر سے قدم کسی لیے راہگیر نکالیں

گلزار بخاری

دائم نظر ہے تازہ جہاں پر لگی ہوئی
اک دھن ہے آدمی کو برابر لگی ہوئی

رہتا ہے کوئی دوسرا اندر مکان کے
تختی ہے اور نام کی باہر لگی ہوئی

کتنے ہی اُٹھ گئے ہیں مگر اس کے باوجود
رہتی ہے بھیڑ دہر میں اکثر لگی ہوئی

اوجھل رہے کہ خاک نشیں تھے نشیب میں
احباب کی نگاہ تھی اوپر لگی ہوئی

گلزارؔ پل کی بھول کا انجام دیکھیے
جیون کا روگ بن گئی ٹھوکر لگی ہوئی

غزل

صبح کا یہ فرض ہے، سُورج کو لائے اور بس
یاد کا شکنوں بھرا بستر اُٹھائے اور بس

ہم جلا لیں گے خود اپنی آنکھ میں اپنے دیے
رات کا یہ کام ہے، ہم کو جگائے اور بس

مسئلہ یہ ہے کہ دل جینے نہیں دے گا ہمیں
مدّعا یہ ہے کہ دل ہی ٹوٹ جائے اور بس

اُس میں اپنا عکس ہم ڈھونڈیں، ہمارا حوصلہ!
وہ مسلسل آئنہ ہم کو دکھائے اور بس

عشق آخر عشق ہے، ہو جائے تو پھر آدمی
باقی ماندہ کام سارے بھول جائے اور بس

ہم محبت میں اگر ہارے تو بس اتنا ہوا
رو دیے، دو چار دن آنسو بہائے اور بس

خوش نصیبی اس سے بھی بڑھ کر ہے کیا خالدؔ کوئی
کم نصیبوں کو زمانہ بھول جائے اور بس

خالد علیم

غزل

احمد حسین مجاہد

جچا نہ کوئی بھی منصب نگاہ میں اپنی
میں آ گیا ہوں پلٹ کر پناہ میں اپنی

ہزار نذر کرے اپنی کائنات کوئی
کسی کو بار نہ دوں بارگاہ میں اپنی

خود آگہی کے شہیدوں میں ہو شمار مرا
میں اپنی جان سے جاؤں تو راہ میں اپنی

کوئی نہ دیکھے یہ عجز و نیاز کے پیوند
لگا رکھے ہیں جو میں نے کلاہ میں اپنی

لڑوں گا اور اکیلا لڑوں گا اپنے خلاف
کوئی عدو ہے نہ کوئی سپاہ میں اپنی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ظاہر نہ کسی کور نظر پر بھی ہُوا میں
کیا فرق پڑا، تجھ پہ کُھلا، یا، نہ کُھلا میں

غزل

عشق کی پھر سے داستاں لکھوں
ان بہاروں کو میں خزاں لکھوں

قدرِ انساں بدل رہی ہے یہاں
کیوں زمیں کو میں آسماں لکھوں

چھا گئے ہیں جہاں پہ سناٹے
کس طرح حالِ بے اماں لکھوں

ظلم اور جبر ہر طرف ہے یہاں
کیسے انساں کی داستاں لکھوں

ہو گیا ہے لہو لہو گلشن
زندگی کو میں خونچکاں لکھوں

قتل ارمان کا ہوا ہے جہاں
اُس کو میں کیسے گُلستاں لکھوں

کاٹے کٹتی نہیں یہ تنہائی
ہجر کو کس کی میں زباں لکھوں

میرا وجدان جگمگا اُٹھے
جب مکاں کو میں لامکاں لکھوں

ایک اندیشہ ہے نیا ہر روز
روگ اپنا بھلا کہاں لکھوں

اُس کے وعدے وعید کو تاثیر
میں اگر وقت کا زیاں لکھوں

تاثیر نقوی

غزلیں

کل مجھ سے جو کہتے تھے کہ کیوں رہتے ہو خاموش
بولا میں جب اُن سے تو ہوئے کیوں وہ گراں گوش

غم بھی ہیں اگر ساتھ خوشی کے، تو نہ گھبرا
ہیں روزِ ازل سے ہی گل و خار، ہم آغوش

پیوستہ ہیں اک دوسرے سے، علّت و معلول
تیرا ہے قصور اور کسی کا نہ کوئی دوش

کر سکتی ہے کیا فکرِ سلیم، اپنا کوئی کام
جب جوش کے ہو زیرِ نگیں، سلطنتِ ہوش

آقا ہے مرا سُرمہ، تیری خاک کفِ پا
ہے تاجِ فضیلت مرے سر کی، تری پاپوش

سید قاسم جلال

رات دن اک کشمکش، میرے دماغ و دل میں ہے
ڈھونڈتا ہوں میں جسے، وہ کون سی محفل میں ہے

خوں ابھی کافی رگِ جانِ تنِ بسمل میں ہے
"دیکھتے ہیں زور کتنا، بازوئے قاتل میں ہے"

ہے تحرک اور تموّج ہی سے دریا کی شناخت
خامشی شہرِ خموشاں کی، اگر ساحل میں ہے

جانے کب پہنچیں گے قاتل، کیفرِ کردار تک
خونِ مقتولاں، تلاشِ منصفِ عادل میں ہے

ممکن ہے کہ اندر سے ہو کمزور سا اِنساں
جس کا نظر آتا ہے قوی، ہم کو، تن و توش

تلوار لیے، دشمنِ جاں، سر پہ کھڑا ہے
اور قوم ابھی نکتۂ غفلت میں ہے مدہوش

ہوتا نہیں بیدار جلال، اُس کا کبھی بخت
اغیار کی محتاج ہو جو، ملّتِ کم کوش

اس جہاں میں پائے جنّت اور ہو وہ دائمی
محو، انساں آج تک، اس سعی لاحاصل میں ہے

آج کے انساں کے دل میں حشر برپا ہے، مگر
یہ بھی مشکل ہے سمجھنا اس کو، کس مشکل میں ہے

ہے مسافر کے لیے لازم سمجھنا، یہ جلال
آخری اس کا پڑاؤ، کون سی منزل میں ہے

غزل

اُترتی شام، کسی شب کی اِبتدا ہوں میں
کسی مُنڈیر پہ رکھّا ہوا دِیا ہوں میں

مِلا تھا راہ میں اک لمحۂ وصال مجھے
چُھوا تو صورتِ جُگنو چمک اُٹھا ہوں میں

جسے برسنا ہے شب بھر کسی شبستاں میں
اُداس آنکھوں میں ٹھہری ہوئی گھٹا ہوں میں

ہٹا مجھے، یا مرے راستے سے خود ہٹ جا
پہاڑ بن کے ترے سامنے کھڑا ہوں میں

کوئی کہانی سناؤ، کہ رات کٹ جائے
کسی اُداس شبستاں کا رَت جگا ہوں میں

کچھ اور لوگوں نے رہنا ہے اب یہاں آ کر
سو اِس مکان کو اَب چھوڑے جا رہا ہوں میں

انیسِ جان! مجھے پہچاننے کی کوشش کر
ترے لیے ترے اعمال کی جزا ہوں میں

محمد انیس انصاری

غزل

جان کاشمیری

کمالِ عزم کی یہ انتہا ہے
پرندہ بن پَروں کے اُڑ رہا ہے

بُجھا تو تیرگی سے مِل گیا ہے
حقیقت میں دیا، روشن دیا ہے

سوادِ روح کی مستی میں گُم ہوں
مِرا تن مجھ سے پیچھے رہ گیا ہے

گھڑی بھر کو وہ میرا ہمقدم ہو
مِری رفتار سے جس کو گلا ہے

مریضِ دل کی حالت دیدنی ہے
مرض سُن کر مسیحا مر گیا ہے

خدا رکھے نظر میں کُل جہاں کو
کوئی ہے جو خدا کو دیکھتا ہے

بھرے مطلق نہیں ہے زخم لیکن
چھپانے کا سلیقہ آ گیا ہے

غزلیں

نہیں آساں چمن میں اب تلاشِ رنگ و بو کرنا
گلابوں کی حسیں رت میں کسی کی جستجو کرنا

بہت سے راز افشا ہوں گے تجھ پر زندگانی کے
دیے کو پھر کسی دن تم ہوا کے روبرو کرنا

خزاں میں ٹوٹتے ہیں آئنے اور زخم کھلتے ہیں
بہت مشکل ہے اس موسم میں زخموں کو رفو کرنا

تمہیں احساس اپنی ذات کا ہونے لگے گا یوں
ملے جب آئنہ تو خود کو اس کے روبرو کرنا

سمجھنے اور پرکھنے کا عمل دشوار ہوتا ہے
بہت آسان ہوتا ہے کسی پر گفتگو کرنا

میں اب اقبال اس سائے کے پیچھے کس لیے بھاگوں
جو ملتی ہی نہیں اس چیز کی کیا آرزو کرنا

اقبال سروبہ

شعر اشکوں کی روانی میں کہے جاتے ہیں
تب سماعت کے دریچوں سے سنے جاتے ہیں

اتنی شدت سے نہ رونا کہ سبھی گر جائیں
خواب آرام سے پلکوں پہ رکھے جاتے ہیں

یہ بھی معلوم نہیں جا کے کہاں رکنا ہے
ہم جو اپنی ہی روانی میں بہے جاتے ہیں

اس تماشے سے ہمیں کچھ نہیں لینا دینا
ہم تو اس بھیڑ میں بے کار چلے جاتے ہیں

کاش اقبال ہوں ہم لوگ بھی ان میں شامل
جن کے افسانے محبت سے پڑھے جاتے ہیں

غزل

خدا کا شکر کہ لوگوں نے وہ سنا کم ہے
وگرنہ میں جو انہیں کہہ چکا ہوں کیا کم ہے

چلے گئے کئی پہلے بھی ڈھونڈتے رستے
جو بچ گئے ہیں انہیں بھی اتا پتا کم ہے

تھی اینٹ اینٹ میں بدنیتی کی آمیزش
اسی لیے جو بنایا گیا بنا کم ہے

کسی کے حسنِ ستارہ شکار کے آگے
یہ تخت و تاج و زر و مال دوسرا کم ہے

پلٹ تو سکتا ہے طوفانِ نوح بھی لیکن
نکل کے اشک کسی آنکھ سے رکا کم ہے

مبالغہ نہیں اس میں کہ آسماں سرِ شب
تمھاری آنکھوں کے آگے مجھے لگا کم ہے

بہت سے اور مسائل بھی تھے مجھے درپیش
مری تباہی کا باعث وہ بے وفا کم ہے

تو پھر نکالنی پڑ جائے گی ہمیں تلوار
تمھارے پاس اگر وقت بات کا کم ہے

وہاں پتنگیں اڑانے کہاں چلے راحتؔ
کہ زندگی کے لیے بھی جہاں ہوا کم ہے

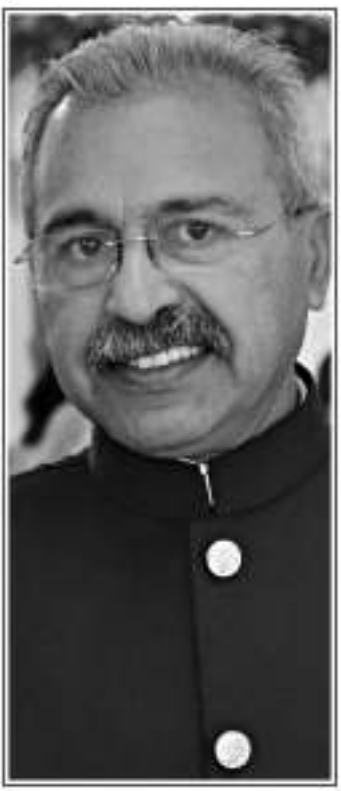

راحت سرحدی

غزلیں

شوقِ منزل لیے چلو تنہا
رہ گزر کو سنوار دو تنہا

ہر مصیبت میں تم رہو تنہا
ظلم جو بھی ہو وہ سہو تنہا

وقت کی تند و تیز آندھی میں
جل سکو گر تو ہاں ! جلو تنہا

گر زباں میں ہو شعلۂ فطرت
بات جب بھی کہو ، کہو تنہا

رشید آفرین

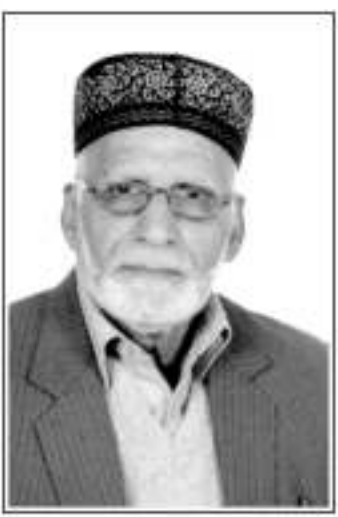

نہیں انسان کے کوئی برابر
ملائک کب ہوئے ہیں اس کے ہم سر
کوئی آئے جواں ایسا دِلاور
بچا لے آدمیت کو جو آ کر
جہاں تنہائیاں ہوں اور اندھیرا
کہیں اُس کو بھلا ہم دشت یا گھر
عجب اک خوف کی زد میں ہوں کب سے
کہیں مجھ کو نہ لے ڈوبے مرا ڈر
لیے پھرتا ہوں جو شانوں پہ اپنے
نہیں میرا مجھے لگتا ہے وہ سر

آرزو کا چمن مہک اُٹھے
کبھی تنہائی میں ملو تنہا

کوئی پوچھے تو حال اُس دِل کا
جو بھری بزم میں بھی ہو تنہا

آفریں کون ساتھ دیتا ہے
زندگانی کے سانس لو تنہا

طلب میری کرم کی بھیک ہر پل
درِ اقدسؐ کا ہوں ادنیٰ گداگر
اُبھر کر جا لگا آخر کنارے
تھا جو بھی بحرِ الفت کا شناور
بلا کا آفریں آشفتہ سر ہے
اگرچہ لوگ کہتے ہیں سخن وَر

غزل

تجھ سے بچھڑ کے غم زدہ ہے اور اُداس ہے
جو چودھویں کے چاند سی روشن کپاس ہے

میری یہ بات دوستو پتھر پہ ہے لکیر
مردم گزیدہ شخص ہی مردم شناس ہے

ہر سمت ہے کرونا ، کرونا کی گفتگو
پھیلا ہوا جہان میں خوف و ہراس ہے

کچھ کو پسند آتا نہیں پیرہن نیا
اُترن کسی کے واسطے عمدہ لباس ہے

دل گدگدا رہی ہیں پھر بارش کی اَنگلیاں
یادوں کی اک حسین ہنسی آس پاس ہے

شعروں سے آ رہی ہے مہک آج تک عقیلؔ
گلشن کی ایک تازہ کلی میرے پاس ہے

عقیل رحمانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن، شب سے جدا ہے نہ الگ عیب، ہنر سے

غزل

ہو نہ پائے گا وہ ادا اک دن
ہونے والا ہے جو قضا اک دن

تیری بھی انتہا قبول نہیں
روشنی سے بھی کہہ دیا اک دن

ایک نقطے بغیر کیا ہوں میں
دائرہ سوچتا رہا اک دن

خواب میں پھر گلہ ہوا مجھ سے
میں شبِ ہجر سو گیا اک دن

میرے ہاتھوں سے تیرے ہاتھ کا لمس
نوٹ گننے میں گر گیا اک دن

شب سنے گی بھری عدالت میں
کیسے دن کے گناہ کا اک دن

اب میں چلتا ہوں احترام کے ساتھ
راستے نے تھا کچھ کہا اک دن

ایک تکیہ مجھے سنانے لگا
اپنے ماضی کا ماجرا اک دن

یاد تیری بڑی حفاظت سے
میں کہاں جانے رکھ گیا اک دن

عمر بھر کا یہ کیف ہے ثاقب
ساتھ اس کے جو جی لیا اک دن

منظور ثاقب

غزل

قصرِ جمالیات کا گہنا زمین ہے
اور آسماں کی حاشیہ آرا زمین ہے

دستِ کرشمہ ساز کے جو ہاتھ میں ہے گیند
خشکی تری کا گویا کہ گولا زمین ہے

عرشِ بریں کہ تخت سا بہتا تھا آب پر
پھر اوج سے فراز نے بولا زمین ہے

نقش و نگار کھینچ کے لوحِ دوام پر
خاکہ سا کیسا خاک بنایا زمین ہے

مٹی جو اپنی خاک اڑانے لگی تو پھر
گردوغبارِ طور نے جانا زمین ہے

بُرجوں کا کھیل جاری وساری ہے اک طرف
ردوبدل میں گھومتا چرخا زمین ہے

اُس نے کہا تو حیرتیں تجسیم ہو گئیں
حیرت کدے میں بیضوی قطعہ زمین ہے

جلوہ نمائے شوق ہے یہ کائناتِ عشق
اس ظرف بے پناہ کا پیندا زمین ہے

اصغر تمام موسموں نے سوچ کر کہا
اپنے تغیرات کا چہرہ زمین ہے

علی اصغر عباس

غزلیں

یہ محفل ہے کہ ہنگامہ، نمی دانم، نمی دانم
ہُوا کیوں دل یہ دیوانہ، نمی دانم، نمی دانم

مرے اپنے کئی غم ہیں، مرے اپنے کئی دُکھڑے
حدیثِ شمع و پروانہ، نمی دانم، نمی دانم

وہ اک جلوہ اگر کچھ ہے تو سب کی دسترس میں ہے
یہ دعویٰ لن ترانی کا، نمی دانم، نمی دانم

خسارے کی تجارت کا، سفر ہی راس ہے مجھ کو
یہ اقدامِ گرانمایہ، نمی دانم، نمی دانم

یہ ڈیرہ ہے محبت کا، عوام الناس کی خاطر
یہ تیرا ہے کہ ہے میرا، نمی دانم، نمی دانم

اِسی میں دن گزرتے ہیں مگر یہ ظاہری دنیا
حقیقت ہے کہ افسانہ، نمی دانم، نمی دانم

گلوں کی دلکشی بھی ہے مرے اطراف میں راشد
مجھے کیوں بھائے ویرانہ، نمی دانم، نمی دانم

ممتاز راشد لاہوری

لاتعلق سے کیوں ہو جانِ مَن
اب کہاں کھو گیا وہ اَپنا پَن

مان جائیں گزارشِ قربت
چھوڑ دیں اب یہ بے رُخی کا چلن

ہم جہاں بیٹھتے تھے سیر کے بعد
منتظر ہے وہ گوشۂ گلشن

سُونی سُونی ہے جلوہ گاہِ جمال
سُونا سُونا ہے وصل کا آنگن

بڑھ رہے ہیں جو فاصلے باہم
بڑھ رہی ہے دماغ کی اُلجھن

رشکِ صد گلشنِ بہاراں ہے
راشد اُس گلبدن کا پیراہن

غزل

بہار آنے کا مژدہ ہمیں سنا دیا ہے
شجر نے آخری پتہ بھی کل گرا دیا ہے

اب اتنے اڑتے ہوئے جگنوؤں کا کیا ہو علاج
دیا تو بس میں تھا اپنے، دیا بجھا دیا ہے

اسے بتا دیا ہے، اب وہ اپنی حد میں رہے
اور اس کی حد ہے کہاں تک، اسے بتا دیا ہے

قدم قدم پہ مجھے روکتا تھا، ٹوکتا تھا
ضمیر جاگا ہوا تھا اسے سلا دیا ہے

نکل نہ پائے گا اک جال سے نکل کر بھی
اک اور جال ہے جو راہ میں بچھا دیا ہے

اب اور موقع ملے گا اگر تو دیکھیں گے
کہ ایک موقع ملا تھا جسے گنوا دیا ہے

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھا نہ ہمیں تُو نے خط و خال سے آگے
اک شہر تھا، اس شہرِ مہ و سال سے آگے

غزل

کام میں لاتا اگر اپنا دماغ
تجھ کو ملتا پھر حقیقت کا سراغ

میکدے میں بات رندوں کی نہیں
اب تو جُرعہ کو ترستے ہیں ایاغ

عمر گزری ہے اُسے پڑھتے ہوئے
مجھ کو لگتا ہے وہ خط پائے کلاغ

آ رہی ہے بو وہاں بارود کی
جو نمونہ تھے اِرم کا باغ و راغ

چاہتا ہے گر تو ہستی کا نکھار
دھو عمل سے بدنما سارے یہ داغ

جسارت خیالی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پریشاں رو ، کسی پہلو نہیں تھا
ترا غم موجۂ خوشبو نہیں تھا

غزلیں

محشر ہی بپا ہے نہ قیامت کی گھڑی ہے
پھر بھی میں جسے دیکھوں اُسے اپنی پڑی ہے

محصور اَنا کا تو نکل آنا ہے مشکل
دیوار پہ دیوار پہ دیوار کھڑی ہے

اوروں کی حفاظت کی وہاں بات کرے کون
منصف کو جہاں اپنی حفاظت کی پڑی ہے

اِس سے بڑی خودداری کی لپٹی ہیں طنابیں
تنہائی کے صحرا میں بڑی ذات گڑی ہے

بے درد نے فرقت کا دیا جب سے مجھے غم
تب ہی سے بڑی آنکھ میں ساون کی جھڑی ہے

لڑنے کو حوادث سے جو تیار ہوئے ہم
اب گردشِ ایام کو خود اپنی پڑی ہے

اِس درجہ کبھی ٹوٹ کے چاہا نہیں تُو نے
شاید یہ تری مجھ سے بچھڑنے کی گھڑی ہے

اُمید پہ قائم ہے زمانے کا بھرم بھی
دل کو بھی تجھے پانے کی اُمید بڑی ہے

پہنچا ہوں کہاں خود سے میں لڑتا ہُوا شاعر
سورج ہے سَوا نیزے پہ اور دھوپ کڑی ہے

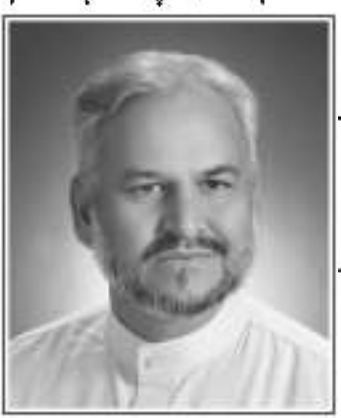

شاعر علی شاعر

کرتا نہیں کسی سے کبھی بات آگ پر
جس شخص نے گزاری ہر اِک رات آگ پر

عشاق کے نصیب میں جلنا ہے کس لیے
لکھی ہیں کس نے ہجر کی آیات آگ پر

اُس کرب انتظار کا عالم نہ پوچھیے
جس میں گزرتے ہیں سبھی لمحات آگ پر

اُس کے بدن کو چھو کے کچھ ایسا لگا مجھے
جیسے کہ پڑ گیا ہو مرا ہات آگ پر

دو چار دن کی بات ہو تو صبر بھی کروں
کیسے گزاروں عمر کی ہر رات آگ پر

تم کو محبتوں کا یقیں کیسے آئے گا
انگارہ دھرلوں ہاتھ پہ، یا ہات آگ پر

رونے سے دل کی آگ بھڑکتی ہے اور بھی
شاعرؔ نے کر کے دیکھ لی برسات آگ پر

غزل

اس نے تصویر بنائی میری
لکھ دیا ساتھ خدائی میری

میں تو دیتا رہا طوفاں کی خبر
کون سنتا تھا دہائی میری

تو بھی بیٹھا ہے مرے دوستوں میں
تو بھی کرتا ہے برائی میری

پہلے اس نے مجھے مٹی کا کیا
اور پھر خاک اڑائی میری

کارنس اس نے بھرا پھولوں سے
اور تصویر جلائی میری

ہو گیا دور وہ مجھ سے ، اُس کو
آگ لگتی ہے پرائی میری

میں نے ہر لفظ مجسم دیکھا
اس نے جب نظم سنائی میری

اس نے اوصافؔ عجب کام کیا
مجھ پہ دیوار گرائی میری

اوصاف شیخ

غزل

دشتِ امکاں سے کوئی راہ نکل سکتی ہے
زندگی ٹھہری ہوئی ہو بھی تو چل سکتی ہے

ناخدا اپنی دعاؤں میں خدا کو رکھے
ناؤ منجدھار میں آ کر بھی سنبھل سکتی ہے

بادشاہوں کو یہ احساس دلاتے رہیے
آپ بدلے تو رعایا بھی بدل سکتی ہے

سلطنت دل کی ترے نام رہے یا نہ رہے
یاد رکھ! تیری حکومت بھی بدل سکتی ہے

آمنے سامنے ہر روز کھڑے رہتے ہیں
ہم اگر چاہیں تو یہ جنگ بھی ٹل سکتی ہے

بات کرنی ہے تو پھر سوچ سمجھ کر کرنا
اپنے ہاتھوں بھی یہ دستار اُچھل سکتی ہے

دیکھ حسرت سے تجھے دیکھ رہا ہے کوئی
یہ جوانی ہے، کسی وقت بھی ڈھل سکتی ہے

ناصر بشیر

غزل

کوئی جلوہ ہو حسبِ حالِ نظر
ہم بھی دیکھیں ذرا کمالِ نظر

نہیں آمادۂ زوالِ نظر
دل کو ہے خوفِ اندمالِ نظر

کہتے ہیں زہر کا علاج ہے زہر
اِک نظر سوئے پائمالِ نظر

خوف کیا ہے نظر لگے سو لگے
لگ نہ جائے کہیں سوالِ نظر

ہاں اُدھر دیکھنا محال نہیں
جانتے ہیں مگر مآلِ نظر

کھل گئے دوجہاں کے نظارے
وہ نظر تھی کہ انتقالِ نظر

صاف رکھتے ہیں فرشِ چشم سحرؔ
ہر گھڑی رہتا ہے خیالِ نظر

حسنین سحرؔ

غزلیں

کہاں تک ساتھ چلتے جُھوٹ کے ہم
مسافر ہی نہ تھے اِس رُوٹ کے ہم

حقیقت جانتے ہیں تیری دنیا
کُھلے رکھتے ہیں تسمے بُوٹ کے ہم

بلندی پر تھے لیکن ایک دن پھر
گرے ہاتھوں سے تیرے چُھوٹ کے ہم

ابھی تو صرف آنکھیں نم ہوئی ہیں
ابھی روئے کہاں ہیں پُھوٹ کے ہم

بہت سی تلخیوں کو پی رہے ہیں
شراب ناب میں اب گھوٹ کے ہم

چراغوں کا دھواں باقی رہے گا
چلے جائیں گے محفل لُوٹ کے ہم

سحر دیکھیں گے اپنی کرچیوں کو
کبھی شیشے کی صورت ٹوٹ کے ہم

سحر تاب رومانی

نیند کے سیلاب میں ہوتا کہیں
اِک جزیرہ خواب میں ہوتا کہیں

وہ نظر مجھ پر نہیں پڑتی اگر
آج بھی گرداب میں ہوتا کہیں

چھیڑتا میں راگ کی صورت تجھے
تُو اگر مضراب میں ہوتا کہیں

شعر لکھنے کا مزا آتا اگر
چاند بھی تالاب میں ہوتا کہیں

ٹاٹ کی جانب کبھی جاتا نہ میں
لُطف جو کمخواب میں ہوتا کہیں

آپ نے رد کر دیا ہے ورنہ تو
گوہرِ نایاب میں ہوتا کہیں

بج رہا ہوتا مرا ڈنکا سحر
میں اگر پنجاب میں ہوتا کہیں

غزلیں

دل بگولے یا کہیں گرداب میں موجود ہے
گردشِ ایام کے تلخاب میں موجود ہے

زندگی کی داستاں کا مرکزی کردار ہوں
تذکرہ میرا تمام ابواب میں موجود ہے

متن میں ہے اک اضافت کی طرح میرا وجود
حرف میں آتا نہیں اعراب میں موجود ہے

وقت کے دھارے میں کیا ہے آدمی کی حیثیت
ایک تنکا سا کہیں سیلاب میں موجود ہے

شاہد اشرف

ہر شجر ہے مہرباں، میرا بدن شل دیکھ کر
میں ٹھہرتا ہوں فقط رستے میں پیپل دیکھ کر

سونے جیسے شخص کے انداز پر حیران ہوں
وہ پریشاں ہو رہا ہے مجھ سا پیتل دیکھ کر

جب اسے مسمار کرنے کے ارادے سے اٹھا
رک گیا دیوار میں نازک سی کونپل دیکھ کر

دشت میں کچھ گھونٹ پانی ہی میسر ہے مجھے
قافلہ رکنے لگا ہاتھوں میں چھاگل دیکھ کر

اک طرف ذہنی دباؤ، دوسری جانب کہیں
اک تناؤ سا مرے اعصاب میں موجود ہے

اب کہیں باقی نہیں مہماں نوازی کا چلن
یہ روایت خطۂ پنجاب میں موجود ہے

پھول کی خاطر لگائی میں نے پانی میں چھلانگ
سانپ بھی شاہد کوئی تالاب میں موجود ہے

جس کی خاطر کر رہا تھا خود کو پس انداز میں
کر دیا میں نے نظر انداز اُسے کل دیکھ کر

چند لمحوں کی خوشی تبدیل غم میں ہو گئی
ایک صحرا سے نکل کے، ایک جنگل دیکھ کر

وہ دکھائی دے رہا ہے دوسری جانب مجھے
ڈر نہیں لگتا ہے شاہد مجھ کو دلدل دیکھ کر

غزل

بات کرتے بیٹھ کر ایوان میں
ہو گئے رسوا کھلے میدان میں

کیا ستم ہے ، کوئی دلچسپی نہیں
آج کے انسان کی انسان میں

کس لئے پیچھے گئے شیطان کے
کیا نظر آیا تمہیں شیطان میں

شاعری کی بات کرتے ہو ، میاں
شاعری ہے میر کے دیوان میں

قید کٹتی جا رہی ہے دم بہ دم
رہ رہا ہوں وقت کے زندان میں

کون کرتا ہے وفا درویش سے
کون رہتا ہے دلِ ویران میں

مر گئی لوگو لتا منگیشکر
ایک واویلا ہے ہندوستان میں

چھوڑ دوں گا میکدے کی محفلیں
توڑ دوں گا یہ سبو رمضان میں

کیا کروں گا دوستوں سے گفتگو
کچھ دنوں سے میں نہیں اوسان میں

اک نیا انصر بناؤ ذائقہ
پیپسی بھی ڈال دو شیزان میں

انصر حسن

غزل

زندگی شام کو دفتر سے نکل آتی ہے
اور اداسی مرے اندر سے نکل آتی ہے

چادریں جتنی بھی تبدیل کروں تیرے بعد
تیری خوشبو مرے بستر سے نکل آتی ہے

میں ہوں وہ آگ کہ جس آگ کو چکھنے کے لیے
جل پری چل کے سمندر سے نکل آتی ہے

جس قدر آپ بتاتے ہیں مجھے صحرا میں
اتنی ویرانی مرے گھر سے نکل آتی ہے

کچھ چراغوں کی محبت بھری یاد آتے ہی
لہلہا کر مری لو سر سے نکل آتی ہے

حضرت حر نے نکل کر یہ دکھایا ہم کو
روشنی رات کے لشکر سے نکل آتی ہے

شام کے وقت سمندر میں لہو گھلتے ہی
تیری صورت مرے ساغر سے نکل آتی ہے

کہاں دبتی ہے دبانے سے محبت ارمانؔ
یہ وہ کونپل ہے جو پتھر سے نکل آتی ہے

علی ارمان

غزل

نعمتِ دنیا ملے جب خواہشِ دنیا نہ ہو
ایسا ہوتا ہے مگر اللہ کرے ایسا نہ ہو

دل کو بینائی عطا کی ہے، تو اے رازِ ازل
روح کے اندر اُتر آ طور پر افشا نہ ہو

عشق بھی کیا عشق ہے جو ہمدمِ صحرا نہیں
اشک بھی کیا اشک ہے جو ہم سرِ دریا نہ ہو

آئنے ہی آئنے ہوں آئنوں کے روبرو
دلنشیں چہرے ہوں، لیکن ایک بھی تجھ سا نہ ہو

مجھ پہ ظاہر ہو گیا جو اپنے باطن کی طرح
طور پردہ کم نما شاید کبھی پیدا نہ ہو

زندگی پر حق نہ ہو تو موت پر کیا اختیار
آدمی مجبور ہو لیکن، خدا! اتنا نہ ہو

اک ذرا تعریف پر حیران ہے تُو کس قدر
جیسے تُو نے زندگی بھر آئنہ دیکھا نہ ہو

کُھل گئے ہیں شہر بھر کے سب دریچے دفعتاً
دشت پھر کر اجنبی وہ لوٹ کر آیا نہ ہو

کیا غبارِ خواب وخُوں اٹھتا ہے میری خاک سے
کیا بکھرتا جا رہا ہے دل کا شیرازہ نہ ہو

یہ تو ممکن ہے کہ ناواقف ہو میرے حال سے
یہ نہیں ممکن کہ اُس کو بالکل اندازہ نہ ہو

اور کیا بے معنویت ہو گی اے عمرِ عزیز!
زندگی بھر خواب دیکھیں، اور کوئی پورا نہ ہو

یاد ہے مجھ کو وہ کوہِ طور پر جانا مرا
اور پھر تیرا وہ کہنا جا میاں! موسیٰ نہ ہو

سنگِ اسود چُھو کے میں نے رب سے مانگا ہے اُسے
کیسے ممکن ہے کہ وہ کافر مرا شیدا نہ ہو

اے ستارو! ماہ پارو! اے چراغو! جگنوؤ!
روشنی کا اصل میرے یار کا سایہ نہ ہو

تجھ کو دیکھوں تو ٹھہر جاتی ہے ساری کائنات
دل تو یوں رُکتا ہے جیسے یہ کبھی دھڑکا نہ ہو

دل کے آئینے میں تیرے عکس کو کر کے حنوط
اتنا دیکھا ہے کہ خود کو تُو نے بھی دیکھا نہ ہو

اس قدر دلچسپ ہے اے دوست! تیرا غم کہ ہم
ساری، ساری رات روئیں پھر بھی دل ہلکا نہ ہو

دو مثالیں سامنے تھیں قیس کی، منصور کی
لاکھ سمجھایا تھا ساگر عہد میں یکتا نہ ہو

محمد سلیم ساگر

غزل

اندھیری رات میں روشن دیا بناتے ہوئے
گزر گیا ہے کوئی نقشِ پا بناتے ہوئے

ذرا سی دیر نہیں کی گزرنے والوں نے
میں پائمال ہوا راستہ بناتے ہوئے

یہاں پہ ایک شجر تھا ہرا بھرا پہلے
گھٹن سے مر گیا تازہ ہوا بناتے ہوئے

لپٹ کے خواب میں چپ چاپ سو گیا آخر
میں رات درد کو اپنی دوا بناتے ہوئے

فصیلِ شہرِ تمنا کی خیر ہو یارب
غم آ رہے ہیں بہت قافلہ بناتے ہوئے

نہ چاند سامنے آیا نہ رات ختم ہوئی
ستارے ٹوٹ گئے دائرہ بناتے ہوئے

اسے جو دیکھا تو محفوظ کرنے بیٹھ گیا
کمالؔ آنکھ کو میں کیمرا بناتے ہوئے

اشرف کمال

غزلیں

مت کہہ مجھے بیکار، مرے یار، انا الاشک
اک روز میں ہوں گا تجھے درکار، انا الاشک

میں اس کے شہیدوں کی ہوں تاریخ کا راوی
ہوں خواب قبیلے کا عزادار، انا الاشک

پھر آنکھ سے بھی دیس نکالا مرا آیا
بس اتنا بتایا تھا کہ سرکار، انا الاشک

کیوں اتنا گھمنڈ آپ کو ہے ضبط و انا پر
کر جاؤں گا مسمار یہ دیوار، انا الاشک

یہ آنکھ کی سرحد بھی بدل دیتی ہے سب کچھ
اس پار انا الحزن تو اُس پار، انا الاشک

یہ سارے سخنور مجھے بس غور سے دیکھیں
ہوں میں بھی فصیحائی کا شہکار، انا الاشک

منزل الجھ گئی ہے میاں راستے سمیت
ہم پھر بھی چل رہے ہیں اسی سانحے سمیت

دنیا میں کچھ نہیں ہے سوائے وصال کے
تجھ کو زمیں میں گاڑ دوں اس فلسفے سمیت؟

اس میں لکھا ہوا ہے سبھی برج ہیں خلاف
تو پھر بھی ہے قبول اسی زائچے سمیت

سننے میں آ رہا ہے کہ تو عالی ظرف ہے
اے ہجر! دے پناہ مجھے قہقہے سمیت

دو دو عطا ہوئی ہیں یہ شاید اسی لیے
دیکھیں گی تجھ کو ساتھ میں آئے ہوئے سمیت

پھر ہم بھی مان لیں گے مصور ترا کمال
تصویر گر بنا دے مری واقعے سمیت

لے دیکھ تیرے حکم کی تعمیل ہو گئی
تجھ کو بھلا دیا ہے ترے ذائقے سمیت

اظہر عباس

غزل

وہ جاگتا ہے ابھی تک، غنود میں ہے کہاں
کمی تھکن کی مگر اُس وجود میں ہے کہاں

کرے رکوع تو ٹانگوں پہ کپکپی چھائے
وہ ولولہ، وہ جوانی، سجود میں ہے کہاں

میں اپنے پاؤں کی مٹی پہ جم کے بیٹھا ہوں
جو میرا کنج ہے، تیری حدود میں ہے کہاں

میں اپنا کر کے خسارہ، ہوں مطمئن جیسے
وہ نفع مجھ کو ملا، تیرے سُود میں ہے کہاں

بکھیرتا ہوں مضامینِ نو کو کاغذ پر
جدیدیت، یہاں آئے وفود میں ہے کہاں

یہ لطفِ خاک نشینی بھی عارضی شے ہے
کہ مستقل سی بقا، ہست و بود میں ہے کہاں

سُلگ رہا ہے جگر خشک لکڑیوں کی طرح
دُھواں جو دل سے اُٹھا، اور دُود میں ہے کہاں

کرو تلاش مزا میرا گم شدہ پھر سے
مزا وہ اُن سا کسی بھی سُرود میں ہے کہاں

بھٹک رہا ہے زمانے کی راہِ غفلت پر
یہ طفلِ نو ابھی اپنی قیود میں ہے کہاں

زمیں سے تا بہ فلک آفتاب چھایا ہے
ہنر یہ اور کسی کے وجود میں ہے کہاں

آفتاب خان

غزل

میں چل رہا تھا ترے ساتھ کس یقین کے ساتھ
ترا بھی رابطہ نکلا منافقین کے ساتھ

ہر ایک رند کی حیرت تھی دیکھنے والی
شریف زادوں کو دیکھا جو بدترین کے ساتھ

جب آسمان پہ جوڑے بنائے جا رہے تھے
تو خال خال حسیں تھا کسی حسین کے ساتھ

جو سادہ دل ہیں وہی دل کو راس آتے ہیں
میں عشق کر نہیں سکتا کسی ذہین کے ساتھ

تمام شہر نے جھوٹی خبر کو مان لیا
صغیر دیکھا گیا ایک مہ جبین کے ساتھ

صغیر احمد صغیر

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

محفلِ ماہتاب میں نجمِ سحر نہیں تو کیا
لاکھ نیاز مند ہیں ، ایک اگر نہیں تو کیا

غزل

منزل کی خبر راہ جُدا کر کے ملی ہے
یاروں کی سمجھ یار خفا کر کے ملی ہے

جو چیز ملی ہے ہمیں مَر مَر کے ملی ہے
کوشش سے ملی ہے کہ دُعا کر کے ملی ہے

ہیں اور بھی دنیائیں زمیں سے بھی کہیں دُور
یہ عقل بصارت کو خدا کر کے ملی ہے

آیا نہ کوئی جن کو پکارا تھا بھرم سے
اپنی بھی خبر آج صدا کر کے ملی ہے

اعجاز روشن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سوچیں تو ہوائیں تہِ اشجار رواں ہیں
دیکھیں تو سرِ شاخِ نظر، برگ نہ بر ہے

غزل

کچھ اور نہیں صرف بزرگوں کی دعا ہے
جس اُور بڑھا ہوں میں ، وہ در کھلتا گیا ہے

یوں گھورتے ہیں مجھ کو ترے شہر کے باسی
جیسے کہ محبت نہیں کی ، جرم کیا ہے

میں جال میں الجھا ہوا تھا اور اچانک
صیاد مرے پاؤں میں خود آن گرا ہے

یہ عشق ، محبت تو ہے ایمان کا حصہ
شک ذہن میں در آیا ، مرا جرم بڑا ہے

آہٹ کوئی محسوس ہوئی ہے سرِ دہلیز
دستک کی ضرورت نہیں ، دروازہ کھلا ہے

میں کچھ بھی نہیں تھا ہے محبت کی کرامت
اس نے ہی مجھے ہونے کا احساس دیا ہے

برباد کیا جس نے وہی کہتا ہے شاہد
یوں اُجڑا ہوا دیکھ کے افسوس ہوا ہے

شاہد فرید

غزلیں

نیند آتی ہے مگر خواب نہیں آتے ہیں
مجھ سے ملنے مرے احباب نہیں آتے ہیں

شہر کی بھیڑ سے خود کو تو بچا لاتا ہوں
گو سلامت مرے اعصاب نہیں آتے ہیں

تشنگی دشت کی دریا کو ڈبو دے نہ کہیں
اس لیے دشت میں سیلاب نہیں آتے ہیں

ڈوبتے وقت سمندر میں مرے ہاتھ لگے
وہ جواہر جو سرِ آب نہیں آتے ہیں

یا انھیں آتی نہیں بزمِ سخن آرائی
یا ہمیں بزم کے آداب نہیں آتے ہیں

ہم نشیں دیکھ مکافاتِ عمل ہے دنیا
کام کچھ بھی یہاں اسباب نہیں آتے ہیں

رمزی آثم

ہونٹ اچھے ہیں ہنسی اچھی ہے
جتنی مل جائے خوشی اچھی ہے

میں سمجھتا ہوں مکمل خود کو
دوست یہ تیری کمی اچھی ہے

تم حقیقت میں بہت پیاری ہو
ویسے تصویر بنی اچھی ہے

تم مرے ساتھ ہو اچھا اچھا
آج کی شام تبھی اچھی ہے

ہو چکی اُن کی بھی آنکھیں بنجر
جو سمجھتے تھے نمی اچھی ہے

جو ترے گھر کی طرف جاتی ہے
مجھ کو لگتی وہ گلی اچھی ہے

غزل

جو سمت چھوڑ دی ہے ادھر راستہ نہ ہو
یہ بات رہنما بھی ابھی جانتا نہ ہو

جلتے ہوں کچھ چراغ منڈیروں کی اوٹ میں
کھڑکی سے بار بار کوئی جھانکتا نہ ہو

اس وقت ایک بار محبت سے دیکھئے
جس وقت کوئی اور مجھے دیکھتا نہ ہو

ممکن ہے اب بھی طور پہ جلوے ہوں منتظر
ممکن ہے آنکھ والوں کی وہ ٹالتا نہ ہو

اچھا تو میرے ساقیا ایسی شراب لا
سب پی رہے ہوں اور کوئی ڈولتا نہ ہو

ایسی گلی کہ جس میں قیامت کا ہو سماں
ایسا نگر کہ ہم کو کوئی جانتا نہ ہو

شاہد ہمیں تلاش اسی ایک پل کی ہے
آواز آ رہی ہو کوئی بولتا نہ ہو

افتخار شاہد

غزل

آگہی کے سمے بناتے ہیں
جو نئے فلسفے بناتے ہیں

سانحوں سے بچانے والے کیوں؟
ان دنوں سانحے بناتے ہیں

دن کے بستر پہ سونے والے لوگ
رات بھر زائچے بناتے ہیں

شب کا قرضہ اتارنے کے لیے
نیند سے رت جگے بناتے ہیں

سانس کی سرحدیں بچانے کو
خواب میں آسرے بناتے ہیں

اب یہاں کچھ نہیں بنانے کو
اب جواں وسوسے بناتے ہیں

میرے حصے کی دھوپ سے آسیب
چھاؤں اپنے لیے بناتے ہیں

اپنی بے چہرگی چھپانے کو
ہم یہاں آئنے بناتے ہیں

سانس جمنے کے بعد میرے لوگ
برف میں راستے بناتے ہیں

چار موسم کسان ہیں اسحاق
خاک سے ذائقے بناتے ہیں

اسحاق وردگ

غزل

ہر طرف روشنی ہو رہی ہے
دور تیرہ شبی ہو رہی ہے

قتل کرنے کو آئے ہو لیکن
تم سے مل کر خوشی ہو رہی ہے

دو دنوں میں ہی لگتا ہے ایسا
ان کو دیکھے صدی ہو رہی ہے

حالِ دل کس طرح اس نے جانا
ہو نہ ہو مخبری ہو رہی ہے

ان کو بس اک جھلک دیکھتے ہی
دردِ دل میں کمی ہو رہی ہے

اب بچا ہی نہیں کام کوئی
اب تو بس عاشقی ہو رہی ہے

ذکی طارق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چڑیاں اڑ اڑ کر رہ جائیں
بابل کا گھر بھول نہ پائیں

غزل

ایک آہ و بُکا کا میداں ہے
کرۂ ارض محشرستاں ہے

ایلین تھا زمیں پہ آیا ہُوا
سب سمجھتے رہے کہ انساں ہے

غم کا لاوا ہے دل گدازی میں
آتش افشاں میں آتش افشاں ہے

ایسا کیا دیکھا، ایسا کیا سوچا
آنکھ حیراں ہے، دل پریشاں ہے

ہے چراگاہ ایک تجربہ گاہ
ایک چرواہا کیمیا داں ہے

ہم ہیں نُوری برس کی دُوری پر
کم نگاہی کا روشن امکاں ہے

لغزشیں ہیں گھڑی گھڑی شاہد
وقت کا راستہ پھسلواں ہے

شاہد ماکلی

غزل

کیا اُتر آیا کسی غم کا اثر آنکھوں میں
کیوں لیے پھرتے ہو یہ لعل و گہر آنکھوں میں

ہم تو آنے کے لیے کب سے کھڑے ہیں لیکن
تم نے رکھا ہی نہیں ہے کوئی در آنکھوں میں

پیار سے اس کی طرف دیکھ لیا کیا میں نے
وسوسے رہنے لگے بن کے بھنور آنکھوں میں

کب حسیں کوئی اچانک یونہی در آتا ہے
دل کی ہوتی ہے کوئی راہ گزر آنکھوں میں

یوں ہی رونا کہاں آتا ہے کسی کو مقبول
اشک ہوتے ہیں کسی غم کا ثمر آنکھوں میں

سید مقبول حسین

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دستِ ہَوا سے پرتوِ ادراک ہو گئے
بادل بکھر کے دامنِ صَد چاک ہو گئے

غزل

ہم سے یوں ملنے وہ آتے ہیں چلے جاتے ہیں
دل پہ اک زخم لگاتے ہیں چلے جاتے ہیں

آج کو لطف کا باعث نہیں بننے دیتے
ہو گا کل کیا یہ بتاتے ہیں چلے جاتے ہیں

ہم پرندے ہیں شکاری ہیں ہمارے رہبر
جال سازش کا بچھاتے ہیں چلے جاتے ہیں

چھین لی رشتوں کی پہچان بھی مال و زر نے
چمک احباب دکھاتے ہیں چلے جاتے ہیں

اُن کی مرضی ہے وہ آئیں کہ نہ آئیں کیا ہے
ہم کو وہ جب بھی بُلاتے ہیں چلے جاتے ہیں

لاکھ بسمل سے تڑپتے رہیں زخمی ہو کر
ہنس کے وہ تیر چلاتے ہیں چلے جاتے ہیں

چند دکھیارے بپا کرتے ہیں محفل طاہرؔ
حالِ دل سنتے سناتے ہیں چلے جاتے ہیں

طاہر ناصر علی

غزل

دل و دماغ میں جاری ہے جنگ برسوں سے
مٹی ہے جینے کی، کیوں کر اُمنگ برسوں سے

بہشت و خلد میں شاید، اماں ملے تو ملے
زمین زاد، زمیں پر ہے تنگ برسوں سے

غرور دولت و طاقت کا ہے نشہ ایسا
اٹھائے پھرتے ہیں تیر و تفنگ برسوں سے

خرد تو وادیِ ادراک میں مقید تھی
جنونِ عشق بھی لایا نہ رنگ برسوں سے

غلط ہے دعویٔ منصوری و وفا کیشی
کہ دُور سر سے رہا ہے جو سنگ برسوں سے

خدا کا ذکر، ہنود و یہود کیسے کریں
دلوں پہ ان کے لگا ہے وہ زنگ برسوں سے

سمجھ میں آئے تو کیا عالمِ طلسماتی
کہ عقل اپنی تو شوکت ہے دنگ برسوں سے

شوکت محمود شوکت

غزل

ہے اگر دل آستانہ یار کا
لامکاں بھی ہے ٹھکانا یار کا

اپنی ہستی سر بسر کھوئے بغیر
غیر ممکن ، بھید پانا یار کا

وحدہٗ کے نقشِ وحدت پر ہے دال
مختلف چہروں میں آنا یار کا

زد میں ہے فیضان ہر پست و بلند
چُوکتا کب ہے نشانہ یار کا

پوچھ لو ہر سانس کے سُرتال سے
دھڑکنیں بھی ہیں ترانہ یار کا

غم سے کیا نفرت ، خوشی کی کیا ہوس
اِک تعلق ہے دوگانہ یار کا

بانگ ہے توحید کی گویا اذاں
ہے تصور پنجگانہ یار کا

آج کی یہ موت کل کا حشر ہے
وصل کو ہے کیا بہانہ یار کا

مسندِ شاہی کہ اوجِ دار ہو
اصل میں ہے جلوہ خانہ یار کا

فیض رسول فیضان

غزل

امر مہکی

گھر میں کوئی بھی چیز پرانی نہیں رہی
بیتے دنوں کی اِک بھی نشانی نہیں رہی

کمرے میں رتجگے کی مہکتی فضا کہاں
کھڑکی کے ساتھ رات کی رانی نہیں رہی

کردار ختم ہو گئے آخر سٹیج پر
منظر اجڑ گیا ہے کہانی نہیں رہی

پہلی سی ریت دشت میں اُڑتی نہیں امر
دریا میں پہلے جیسی روانی نہیں رہی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی میں کسی رُخ کا، کسی دُکھ کا ہونا
اچھا ہوتا ہے سفر میں کوئی اپنا ہونا

غزل

لوگوں کو غم کا باب سنایا نہیں گیا
چہرے کا درد ہم سے چھپایا نہیں گیا

تیری صدا سے بھر تو گیا ہے مکانِ دل
لیکن وہ چہرہ بام پہ لایا نہیں گیا

بس تیرے دکھ میں چادرِ غم اوڑھ لی مگر
کیسا وہ زخم تھا جو دکھایا نہیں گیا

یہ آبشارِ وقت بھی گرتا رہا مگر
ہم سے تو ایک لمحہ بُھلایا نہیں گیا

یہ چاند تارے تم نے دکھائے تھے کس لیے
جب تم سے اک چراغ جلایا نہیں گیا

اک ہجر بے شمار تھا اک درد بے شمار
اک راز تھا جو اُس کو بتایا نہیں گیا

تیرے لیے سنبھال کے رکھا ہے چاند پر
اک اشک تھا جو ہم سے بہایا نہیں گیا

کچھ اس طرح سے تو نے اکیلا کیا ہمیں
من کا جہان ہم سے بسایا نہیں گیا

اس راہ سے جو تو نے گزرنا نہیں تو پھر
اک آس کا دیا تھا جلایا نہیں گیا

آسناتھ کنول

غزلیں

اوجِ فلک پہ میرا ستارا نہ تھا کبھی
وہ اِس لیے کہ بخت سنوارا نہ تھا کبھی

خُودار اِس قدر تھا کہ ڈُوبی ہزار ناؤ
ساحل پہ دوستوں کو پُکارا نہ تھا کبھی

جب تک وہ بے وفا مرا بازو بنا رہا
میں تو کسی محاذ پہ ہارا نہ تھا کبھی

ہم اُس کو بُھول جاتے اُسی شخص کی طرح
اِس دِل پہ اختیار ہمارا نہ تھا کبھی

کچھ اِس طرح چلی ہیں زمانے کی آندھیاں
لگتا ہے اب وہ شخص بھی پیارا نہ تھا کبھی

قائل مجھے قبول ہی کرنا پڑا اُسے
وہ دردِ یار جو کہ گوارا نہ تھا کبھی

عمر قیاز قائل

سوچتا رہتا ہُوں اکثر یہ مرا دِل کیا ہے دِل
کل بھی یہ تنہا بہت تھا آج بھی تنہا ہے دِل

جانے کس جانب کو برسیں موسموں کی بارشیں
کل بھی صحرا تھا مرا دِل آج بھی صحرا ہے دِل

آج بھی ہونٹوں پہ کندہ ہیں گئے وقتوں کے غم
آج بھی میں غم زدہ ہُوں، آج بھی ویسا ہے دِل

اَب تو کوئی بھی تڑپ کوئی کسک باقی نہیں
جانے والوں کے لیے کیوں غم زدہ رہتا ہے دِل

جانے کن کن دوستوں نے راہ میں چھوڑا مجھے
جانے کن کن دوست داروں نے مرا توڑا ہے دِل

آج بھی آنکھوں سے قائل اشکِ غم ٹپکے بہت
آج بھی برسے ہیں بادل، آج بھی رویا ہے دِل

غزل

مصرعوں سے اپنے مصرعوں کو پھر چھانٹنا پڑا
اپنا لکھا ہوا بھی کبھی کاٹنا پڑا

جِس جِس نے ہم کو چاہا بہت ہم کو تھا عزیز
چاہت میں سب کی خود کو ہمیں بانٹنا پڑا

حالانکہ عشق ہم نے ادھورا کیا مگر
یہ ہجر پھر بھی پورا ہمیں کاٹنا پڑا

جس نے ضمیر بیچا تھا ہیرے کے مول پر
اک روز اس کو ہیرا وہی چاٹنا پڑا

گھر تو بنا لیا ہے پہ نقصان یہ ہوا
آنگن کا سبز پیڑ ہمیں کاٹنا پڑا

پاگل بنائے رکھا تھا دل کو دماغ نے
دونوں کو تنگ آ کے مجھے ڈانٹنا پڑا

عطاالعزیز

غزل

اس خزاں میں کہاں سے لائیں پھول
آؤ ! کاغذ کے ہم بنائیں پھول

سوچتے ہیں تمھاری راہوں میں
اپنی پلکیں یا پھر بچھائیں پھول

جو خزاؤں کی زد میں آئیں گے
لے اُڑیں گی وہی ہوائیں پھول

اوس دھوتی رہی بدن میلے
اور دیتے رہے دعائیں پھول

ہاتھ کانٹوں نے کر دیے چھلنی
کیسی حسرت تھی ہم اُگائیں پھول

جیسے شاخوں سے خار کرتے ہیں
ایسے کرتے ہیں کب وفائیں پھول

دل کی حسرت ہے آج بھی ارشدؔ
اس کے جوڑے میں ہم سجائیں پھول

ارشد محمود ارشد

غزل

عجیب کتنے ہیں دیکھو اندھیری رات کے رنگ
چمکتے شوخ ستارے ہیں کائنات کے رنگ

تمھارا بچ کے نکلنا۔۔۔ تو غیر ممکن ہے
کہ سو فریب میں لپٹے ہیں میری گھات کے رنگ

میں اپنے آپ کو تم سے جدا نہ کر پاؤں
کہ مجھ میں گھل سے گئے ہیں تمھاری ذات کے رنگ

میں کس طرح تری چالوں سے باخبر ٹھہروں
ہر ایک بار نئے تیری واردات کے رنگ

یہ ساحرانہ تکلم، یہ میٹھا لہجہ ترا
بکھرتے جاتے ہیں چہروں پہ تیری بات کے رنگ

کیفی قلندر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سوندھی سوندھی سوچ سے اُٹھی، جذبوں کی مہکار
راہ مہک کی روک نہ پائی، لفظوں کی دیوار

غزل

درونِ ذات سے ملی خبر میں وہ نہیں رہا
میں کس طرف بھٹک گیا اگر میں وہ نہیں رہا

وہ چاہتا ہے عشق میں لگن وہی تڑپ وہی
میں بارہا بتا چکا جگر! میں وہ نہیں رہا

جزائے خیر ہے یہی کہ آج مجھ کو کاٹ دے
ثمر بدست راہرو! شجر میں وہ نہیں رہا

تجھے تھی میری آرزو، مجھے تھی اور جستجو
اُدھر تو وہ نہیں رہا ، اِدھر میں وہ نہیں رہا

وہ برگدوں کی چھاؤں بھی وہ یار بھی وہ گاؤں بھی
ہر ایک چیز ہے وہی مگر میں وہ نہیں رہا

مجھے بتا کہ تو حسین و دلنشین ہے ابھی
مجھے بتا کہ تو ہے وہ اگر میں وہ نہیں رہا

امتیاز انجم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کب یہ دیوارِ بے رُخی نہ رہے
کیا خبر کب وہ اجنبی نہ رہے

غزلیں

کبھی دوستوں نے کبھی دشمنوں نے
کئی بار لوٹا چمن رہبروں نے

لہو سے کیا تر بتر سر زمیں کو
کبھی آمروں نے کبھی لشکروں نے

ستم ہی ستم دیکھ کر کب رہے چُپ
زباں کھول دی بے زباں کنکروں نے

اُسے اک نظر رو بُرو دیکھتے ہی
یقیں کر لیا بے یقیں منکروں نے

مٹائے نشاں نامیوں کے سکندر
کبھی زلزلوں نے کبھی آندھیوں نے

مرزا سکندر بیگ

اب چُپ رہنا ہنسنا رونا ایک برابر ہے
محفل ہو یا گھر کا کونا ایک برابر ہے

جب حاصل لاحاصل سب بے معنی ہو جائیں
پا لینا یا پا کر کھونا ایک برابر ہے

خاک نشینوں کو کچھ غرض نہیں ہے دنیا سے
پھول ملیں یا خار بچھونا ایک برابر ہے

ہم درویش فقیروں کے دل کی اس نگری میں
تانبا ہو یا چاندی سونا ایک برابر ہے

روح نکل جاتی ہے جب اس خاکی پتلے سے
بوجھ بدن کا دھرنا ڈھونا ایک برابر ہے

ڈر جائیں جو لوگ سکندر ظالم لوگوں سے
ان کا ہونا یا نہیں ہونا ایک برابر ہے

غزل

آسماں کی سماعت میں رس گھول کر ختم ہونے لگی داستاں، شب بخیر
پھر سے نخلِ فلک پر بکھرنے لگیں نیلگوں چاند کی پتیاں، شب بخیر

رنج و حسرت میں ڈوبی اے چشمِ غضب اپنی مژگاں پہ بکھرے یہ موتی سنبھال
جانے کس وقت پُرسہ لیے اک ہوا چُوم لے دستِ آزُردگاں شب بخیر

آن لائن ہوئی سبز بتی تو ہم دیر تک ٹکٹکی باندھ تکتے رہے
ہاتھ "کی پیڈ" پر تھرتھراتے رہے لکھتے لکھتے رُکیں اُنگلیاں، "شب بخیر"

تجھ کو اے موسمِ بے ہنر کیا کہوں جو نہ اک شاخِ دل بھی ہری کر سکا
وہ جو پتھر تھا پتھر کا پتھر رہا لمس ہونے لگا رائگاں شب بخیر

خامشی بڑھ گئی لفظ کم پڑ گئے ہم سے ایسے گریزاں ہوئے خوش کلام
سلسلے گفتگو کے ہوئے مختصر رہ گیا رابطہ درمیاں "شب بخیر"

عاطف جاوید عاطف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سرِ میدانِ کارزارِ حیات
ذہن بھی دل کے ساتھ جنگ میں تھا

غزلیں

تعلقات نبھانا اگر ضروری ہے
بہت سی باتوں سے صرفِ نظر ضروری ہے

تقاضے اپنی جگہ ہیں تمنا اپنی جگہ
سفر ضروری دعائے سفر ضروری ہے

جو ظلم ڈھاتے نہیں تھکتے، کہتے پھرتے ہیں
ہمارا خاتمہ ایمان پر ضروری ہے

تعین اس کا ہمیشہ ہی کرتے ہیں حالات
کہ جو بھی چیز یہاں جس قدر ضروری ہے

جو پہلے کہتا تھا اک بار تو چلے آؤ
اسی کی ضد ہے کہ بارِ دگر ضروری ہے

عجب نہیں کہ جو بچھڑے تھے آ ملیں جاذبؔ
اک اعتبار کا رشتہ مگر ضروری ہے

اکرم جاذب

کب سے دریا کے کنارے پہ چلا جاتا ہوں
اٹھتی موجوں کے اشارے پہ چلا جاتا ہوں

مدتوں موجِ مخالف سے الجھنے والا
کیسے حالات کے دھارے پہ چلا جاتا ہوں

خاک سے رشتہ و پیوند نبھاتا ہوا میں
خواب میں ایک ستارے پہ چلا جاتا ہوں

میری محرومیاں اشعار میں ڈھل جاتی ہیں
اس مسافت میں خسارے پہ چلا جاتا ہوں

کام آئی ہے غریبوں کی محبت جاذبؔ
بے سہاروں کے سہارے پہ چلا جاتا ہوں

غزلیں

کسی کی یاد کے صندل میں آگ جلتی ہے
دلِ حزیں ترے جنگل میں آگ جلتی ہے

برس رہے ہیں بہت گرم اشک پلکوں سے
تمہاری آنکھ کے بادل میں آگ جلتی ہے

چمن بہار میں افسردہ ہے تمہارے لیے
گلوں میں، شاخ میں، کونپل میں آگ جلتی ہے

اگرچہ لفظ ہے بس ایک ہی محبت کا
لکھوں جو سرچ میں گوگل میں آگ جلتی ہے

کتاب جنگ و جدل کی لکھی مورخ نے
تو بابِ آخر و اول میں آگ جلتی ہے

تمہارے عشق کی جبرانؔ کیا کہانی ہے
ہر ایک لفظ سے ناول میں آگ جلتی ہے

وسیم جبران

دنیا کو جب تم نے سچا مان لیا ہے
میں نے بھی تقدیر کا لکھا مان لیا ہے

ساری باتیں مان کے ہم تو مر جاتے
اتنا بھی کافی ہے جتنا مان لیا ہے

مجھ کو ہے معلوم وہ ہیر نہیں میری
جس نے مجھ کو اپنا رانجھا مان لیا ہے

سوکھے پتے آج گواہی دیتے ہیں
موسم تھا تم سے وابستہ، مان لیا ہے

کتنے پیار سے تم نے میرا نام لیا
دیکھا آخر مجھ کو اپنا مان لیا ہے

فیصلہ ہے یہ تیرا تو ہم مانیں گے
دل کیسے مانے گا؟ اچھا مان لیا ہے

سارا اُس کا ہی تو قصور نہیں جبرانؔ
میرا بھی ہے آدھا حصہ مان لیا ہے

غزل

دوستی باقی نہیں ہے دوستوں کے درمیاں
گھل رہا ہے زہر یہ کیسا گھروں کے درمیاں

سانس سکھ کا آ نہیں سکتا ہے اس ماحول میں
زندگی کٹتی ہے اپنی وسوسوں کے درمیاں

ہر گھڑی مشکل کھڑی ہوتی ہے میرے سامنے
دائرے بننے لگے ہیں دائروں کے درمیاں

کوئی بھی تسکین کی صورت نظر آتی نہیں
ایک مدت سے پڑا ہوں رنجشوں کے درمیاں

ہے مجھے معلوم میری ایک بھی چلنی نہیں
گھر گیا ہوں دوستوں اور دشمنوں کے درمیاں

پاؤں میں بیڑی نہ پہنا دے کوئی آ کر مرے
میں بھٹک کر رہ گیا ہوں سرحدوں کے درمیاں

زندگی اپنی گزاروں صرف اتنا سوچ کے
خار بھی موجود ہوتے ہیں گلوں کے درمیاں

سخت مشکل میں پڑے ہیں آئنہ ساز آجکل
جانے وہ کب سے کھڑے ہیں آئنوں کے درمیاں

مبتلا مجھ کو کسی تشویش میں کرتا نہیں
مرا اٹھنا بیٹھنا زندہ دلوں کے درمیاں

آجکل اللہ جانے کس لیے خاموش ہے
وہ صدا جو گونجتی تھی پربتوں کے درمیاں

عابدی منزل پہ جانا سخت مشکل ہے مرا
راستہ ملتا نہیں ہے راستوں کے درمیاں

علی حسین عابدی

غزلیں

مجھ سے جانے کیوں روٹھے ہو
سب سے تم ہنس کر ملتے ہو
دل میں اتنا درد چھپا کر
کیسے تم ہنستے رہتے ہو
اپنے گھر کو آ کر دیکھو
اس دل میں بس تم بستے ہو
یاس بھری ان راتوں میں تم
جگنو سے اڑتے پھرتے ہو
ساون کے موسم میں جاناں
بارش سے تم کیوں ڈرتے ہو
اپنا بھی ہے مسکن تب تک
شہر میں تم جب تک ٹھہرے ہو

بشیر احمد حبیب

برسوں کے بعد دل میں وہ جذبہ نہیں رہا
ہم مر مٹے تھے جس پہ وہ چہرہ نہیں رہا
باتیں تو اس کی آج بھی دل کے قریب ہیں
گھر کر گیا تھا دل میں جو لہجہ نہیں رہا
اب مجھ میں بندگی کی وہ خواہش نہیں رہی
تجھ میں بھی بے رخی کا سلیقہ نہیں رہا
اس کی ہنسی میں صرف فریبِ حیات ہے
اس کے لبوں پہ پھولوں کا کھلنا نہیں رہا

قسمت کی فیاضی ہے جو
تم، ہم سے یوں آن ملے ہو
وقت تو چلتا ہی رہتا ہے
تم سو جاتے یا جگتے ہو
نیند میں ڈوبی آنکھوں سے تم
میری نیندیں لے اڑتے ہو
آخر ہم کو ملنا ہی تھا
یوں کا ہے حیران کھڑے ہو
من کی کھڑکی کھول کے دیکھو
بند دریچے کیا تکتے ہو

اک روشنی تو آج بھی اس کی نظر میں ہے
دل میں اتر سکے وہ اجالا نہیں رہا
وہ زلف، وہ گھٹا، وہ مرے دل کے ولولے!
لیکن اب ایسی باتوں کا موقع نہیں رہا
اس کی نظر میں یوں تو فسوں اب بھی ہے حبیب
مدہوش کر سکے جو وہ نشہ نہیں رہا

غزل

ترے بیمار سے اُلجھا ہوا ہے
مسیحا کو نجانے کیا ہوا ہے

سفینہ ساحلوں تک آ تو جائے
ہوا نے راستہ بدلا ہوا ہے

تری جانب قدم اٹھتے نہیں ہیں
مجھے کس ہاتھ نے روکا ہوا ہے

فضا میں تشنگی پھیلی ہوئی ہے
مسافر دشت میں آیا ہوا ہے

اکٹھے گھومتے ہیں قیس و لیلیٰ
زمانہ کس قدر بدلا ہوا ہے

میں اب تک گر گیا ہوتا زمیں پر
کسی کے ہاتھ نے تھاما ہوا ہے

ہمارے گھر کی تاریکی کا عاصمؔ
چراغوں میں بہت چرچا ہوا ہے

عاصم اعجاز

غزل

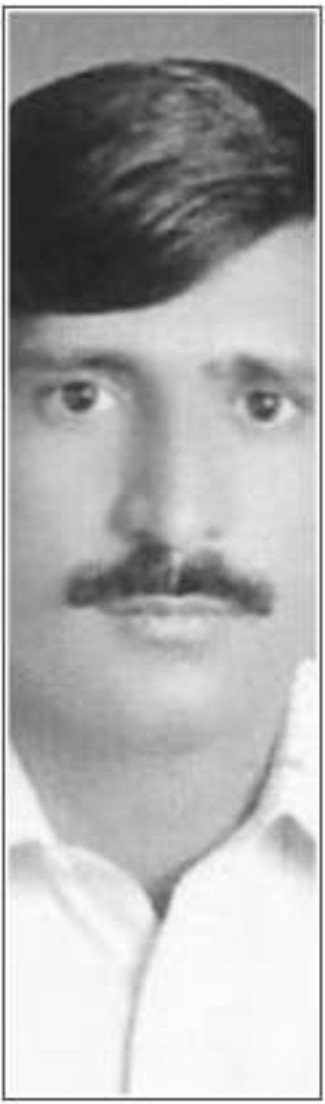

لباسِ تیرگی پہنا ہوا ہے
ہتھیلی پر دیا رکھا ہوا ہے

قیامت ہے کسی کو بھول جانا
مگر یہ فیصلہ اچھا ہوا ہے

نہیں مجنوں کا اب کوئی مقلد
مزاجِ عاشقاں بدلا ہوا ہے

مسافر لوٹ کر گھر آگئے ہیں
ہر اک چہرہ مگر اُترا ہوا ہے

کسی سہمے ہوئے بچے کی صورت
پرندہ پیڑ سے لپٹا ہوا ہے

ترا غم بھی مجھے لگتا ہے جیسے
کوئی مہمان گھر آیا ہوا ہے

مری تشنہ لبی دھوکہ نہ کھائے
وہ بادل ہے مگر برسا ہوا ہے

ہمارا دل بھی اب اعجاز دانش
سمندر تھا مگر صحرا ہوا ہے

اعجاز دانش

غزل

تیرے جانے کا غم نہیں کرتے
تیری یادوں کو کم نہیں کرتے

ہاتھ پکڑا ہے ساتھ چلنے کو
تجھ کو مجبور، ہم نہیں کرتے

رات بھر دل اگرچہ رویا بہت
پھر بھی آنکھوں کو نم نہیں کرتے

تیری چُپ سے یہ جاگتے ارماں
شور اتنا، صنم! نہیں کرتے

تیری چاہت کو بھولنا چاہے
اپنے جی پر ستم نہیں کرتے

روک لیتے ہیں اشک پلکوں پر
تیرے قصے رقم نہیں کرتے

تم سے بڑھ کر ہو پیار اوروں سے
ہم کو تیری قسم، نہیں کرتے

عنبرین عنبر راجپوت

غزل

دنیا نے نفرتوں کو دھرم ، دین کر دیا
بدنام سب نے عشق کا پھر ''شین'' کر دیا

پہلے مجھے نہال بہت دیر تک کیا
پھر اُس ستم شعار نے غمگین کردیا

صاحب! یہ مسئلہ تو محبت کا سہل تھا
اس مسئلے کو آپ نے سنگین کر دیا

اس نے حسیں فضا میں مرا ہاتھ تھام کر
اُس پل سماں کو اور بھی رنگین کر دیا

تجھ کو تو گردشوں نے زمیں پر گرادیا
اور مجھ کو مشکلات نے شاہین کر دیا

عقلی کی وادیوں سے صدا آرہی ہے یہ:
''دنیا کو رب نے وقفِ سلاطین کر دیا''

افسوس ایک دین کے خادم نے پھر جیا
اک دیندار شخص کو بے دین کر دیا

جیا قریشی

غزل

میں دل ہر اک پر نثار کرتی تو ایک دنیا پڑی ہوئی تھی
وفا کا میں کاروبار کرتی تو ایک دنیا پڑی ہوئی تھی

بھرے ہوئے اس جہان سے میں بچا کے دامن گزر رہی ہوں
کسی سے میں آنکھیں چار کرتی تو ایک دنیا پڑی ہوئی تھی

تمھی محبت کی ابتدا ہو، تمھی محبت کی انتہا ہو
میں عشق جو بار بار کرتی تو ایک دنیا پڑی ہوئی تھی

چمن میں کتنے ہی پھول تھے جو زمانہ جھولی میں بھر رہا تھا
میں ان میں خود کو شمار کرتی تو ایک دنیا پڑی ہوئی تھی

خطا ہوئی جو سُنا ہے میں نے بس اپنی پہلی نظر میں تم کو
ذرا سا میں انتظار کرتی تو ایک دنیا پڑی ہوئی تھی

نہ جانے وہ کیوں حیات مجھ کو زمانے جیسا سمجھ رہا ہے
یہ طرز میں اختیار کرتی تو ایک دنیا پڑی ہوئی تھی

شفقت حیات شفق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کر لے نہ لکیروں میں گرفتار مجھے بھی
وہ ، نقش نہ کر دے سرِ دیوار مجھے بھی

غزل

تجھے برباد کرنا تھا مجھے برباد ہونا تھا
مجھے برباد کر کے ہی تجھے آباد ہونا تھا

مرے اشکوں سے ہی بجھنی تھی تیرے شوق کی آتش
مجھے ناشاد کر کے ہی تجھے پھر شاد ہونا تھا

نہ مل پایا کوئی کونا تمہارے دل کے آنگن میں
یونہی اک دن مجھے بھولی ہوئی سی یاد ہونا تھا

کبھی تو مجھ کو ملنی تھی مری پرواز کی طاقت
کبھی تو قیدِ ناحق سے مجھے آزاد ہونا تھا

بچھڑ کر مجھ سے خوش رہنے کا دعوی اسکو ہے لیکن
مجھے کھونے کا پچھتاوا تو میرے بعد ہونا تھا

نائلہ راٹھور

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا
اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کرنا

غزل

بہت ہم نے خسارے میں حکومت دیکھ لی اپنی
بسر فاقہ کشی میں ہو رہی ہے زندگی اپنی

جدھر دیکھو، ہے رنگا رنگ ملبوسات کی رونق
لبھائے گی یہاں کیسے کسی کو سادگی اپنی

پڑے ہیں روز و شب پیچھے ہمارے لوگ بستی کے
بہت حیران ہیں کب تھی کسی سے دشمنی اپنی

ہے اپنے آپ میں گم ہر کوئی اس شہر میں، لیکن
نظر میں سب کے پھر بھی آ گئی آوارگی اپنی

سنا ہے اس کے ہونٹوں سے ہمارا شعر یاروں نے
ہمیں بھی کام کی لگنے لگی ہے شاعری اپنی

جو اپنے آپ سے آگے نہیں کچھ دیکھتے ساگر
وہ کیا تقسیم کر پائیں جہاں میں آگہی اپنی

صدام ساگر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن، شب سے جدا ہے نہ الگ عیب، ہنر سے

غزل

جو لوگ اٹھائے ہوئے کاندھوں پہ مجھے ہیں
حیرت ہے، یہی مجھ کو گرانے میں لگے تھے

میں عشق سے وابستہ ہوں، سو تم سے گلہ کیا
دنیا! تری باتوں کو بھلانے میں لگے تھے

احرام ستر پوشی کا باعث ہے مگر ہم
اشکوں سے گناہوں کو بہانے میں لگے تھے

اس شہر میں حامی نہیں کوئی بھی ہمارا
سب دل کو طرفدار بنانے میں لگے تھے

پھر دیکھنے آئے تھے فلک زاد تماشا
ہم خاک نشیں دھول اڑانے میں لگے تھے

تعبیرِ وفا روزِ ازل سے ہی ملی، پر
کیوں عالمِ برزخ سے بلانے میں لگے تھے

انیس احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد وہ بطِ مے، وہ بتِ ساحلِ کاہل
شامِ شبِ مہتاب تھی، پردیس میں تھا میں

غزلیں

وہ گیا ہے تو ٹھکانہ نہ رہا دل کا کوئی
شہر بھر میں نہیں اک آدمی محفل کا کوئی

ویسے دریا کا بھی ہوتا نہیں اندازہ کچھ
اور پتہ بھی نہیں ملتا ہمیں ساحل کا کوئی

لاش پر لاش پڑی ہے مگر اس کے باوصف
نہیں بتلاتا پتہ شہر میں قاتل کا کوئی

جانتے سب ہیں کہ ہم راہ میں چھوڑ آئے ہیں
اور نشاں ہم سے نہیں پوچھتا منزل کا کوئی

چاہے تاخیر سے لیں کام یا عجلت میں پڑیں
دوسرا در ہی نہیں آپ کی سائل کا کوئی

عنبرین علی خان

جو فرق جان گئے ہم عروج و پستی میں
کوئی ملول نہیں ہو گا تنگدستی میں

کسے پکارتی میں کس طرح صدا دیتی
پرائے لوگوں کی اس اجنبی سی بستی میں

بس ایک آس بڑھاتی ہے شوق جینے کا
بس ایک شخص حرارت ہے نبضِ ہستی میں

وہ میری ذات سے بڑھ کر مجھے عزیز ہوا
میں سرخرو ہوئی اس دور خود پرستی میں

خمار میری نظر کا ہے اس کی باتوں میں
کلام کرتا وہ اچھا لگا ہے مستی میں

غزل

زمین جلتی تھی چرخِ کبود جلتا تھا
دھواں اگلتی تھیں سانسیں وجود جلتا تھا

ہم ایک دوسرے کی راکھ سب اڑاتے تھے
حسد کی آگ میں شہرِ حسود جلتا تھا

میں اپنی آگ میں جلتا ہوں دوسروں کے لئے
ترا چراغ برائے نمود جلتا تھا

بنائیں عشق میں جتنی بھی ہم نے تصویریں
کہ قوس جب بھی لگائی عمود جلتا تھا

ہماری آنکھ کا ایندھن اسے میسر تھا
ہمارے دل میں چراغِ درود جلتا تھا

یہ روشنی بھی روایت پسند تھی ایسی
دیے میں عکسِ رسوم و قیود جلتا تھا

ضیا دھواں مرے اندر ہی جمع ہوتا تھا
ندامتوں سے جو تنگِ وجود جلتا تھا

ضیا شاہد

غزل

کب نگاہِ کرم نہیں ہوتی
تشنگی پھر بھی کم نہیں ہوتی

اتنا ارزاں لہو ہے آدم کا
کوئی بھی آنکھ نم نہیں ہوتی

راہِ ہستی بڑی کٹھن ہی سہی
چاہ جینے کی کم نہیں ہوتی

میں ہی عادی سا ہو گیا یا پھر
بے رُخی کچھ ستم نہیں ہوتی

سبھی کچھ ہے روا سیاست میں
اس میں کوئی قسم نہیں ہوتی

کون سی بات ہے مری محسن
جو کسی جا رقم نہیں ہوتی

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ناقدوں نے مجھے پرکھا' خالد!
خاک صحراؤں نے چھانی میری

غزل

دن بھی لے، رات اٹھا، چلتا بن
سب مُراعات اٹھا، چلتا بن

عشق میں نام و نسب بے معنی
بیچ سے ذات اٹھا، چلتا بن

موم، سورج کا بھلا کیا رشتہ
دور ہٹ، ہاتھ اٹھا، چلتا بن

دو فلکوں کے بھی برابر نہ ہوئی
خام اوقات اٹھا، چلتا بن

پنکھڑی، لب، ہیں پرانے قصے
نازکی ساتھ اٹھا، چلتا بن

زہر ہیں، بھیک میں القاب مجھے
چل یہ خیرات اٹھا، چلتا بن

منزلِ شوق یقیں ہے مدحر
اپنے خدشات اٹھا، چلتا بن

عمران حیدر مدحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سبھی آنکھیں ہیں، ہماری آنکھیں
گھل کے بہہ جائیں نہ ساری آنکھیں

غزل

ہم نے ایک کاغذ پر لکھ دیا خدا حافظ
دوستوں کے ہاتھوں میں ہے دیا' خُدا حافظ

وحشتوں سے اب جس کی ڈر رہے ہیں وحشی بھی
ایسے دشت کی جانب میں چلا' خُدا حافظ

مجھ کو جس کا مدت سے انتظار تھا لوگو!
قافلہ..... مجھے لینے..... آ گیا' خُدا حافظ

میں نے جس کو برسوں سے اپنے دل میں پالا تھا
غم وہی..... مرے دل کو' کھا گیا' خُدا حافظ

وہ کہ جس کے آنے سے پھول کھلنے لگتے تھے
زین! موسمِ خوشبو' وہ گیا' خُدا حافظ

زین علی رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی ساتھ رہے گی کہ وہ یہ دیکھ سکے
سانس کب لیتے ہیں، دم دیتے ہیں نخچیر کہاں

غزل

گھر ہوتے بھی رہ گزر میں ہونا
کہتے ہیں اِسے سفر میں ہونا

اِک یادِ گزشتہ کے کرم سے
ہر شام نئی سحر میں ہونا

دستک کے جواب میں خموشی
بتلاتی ہے اُس کا گھر میں ہونا

جانے سے ترے کھلا ہے مجھ پر
دیوار کا عین در میں ہونا

میں بھی کوئی بے خبر نہیں ہوں
اور اُس کا بھی ہر خبر میں ہونا

دنیا سے چھپا رہا ہے مجھ کو
ہر وقت کسی نظر میں ہونا

کنور امتیاز احمد

غزل

محبت کی گواہی مانگتے ہیں
رقیباں کیوں تباہی مانگتے ہیں

کسی صورت تری قربت نہ پائی
سو مجبوراً جدائی مانگتے ہیں

گھنے جنگل میں ایسی رہ بنائی
شجر اب مجھ سے راہی مانگتے ہیں

اسی اک خوف میں مَیں لکھ نہ پایا
مرے ٹیچر صفائی مانگتے ہیں

برانڈڈ سوٹ شرمندہ ہوا ہے
وہ رہ چلتے سے ٹائی مانگتے ہیں

مسیحائی کا دعویٰ رکھ سرہانے
مسیحا ہم دوائی مانگتے ہیں

نہ دے گندم کا دانہ اے زمیں دار
یہ دہقاں ہیں، کٹائی مانگتے ہیں

اعجاز رضوی

ہمارے کچھ معاملے زمیں پہ حل نہیں ہوئے

شاعرِ امروز
مظہر نقوی

شاہد ماکلی

مظہر نقوی کی تخلیقی ندرت وقدرت حیرت انگیز اور لائقِ رشک ہے۔ ان کی غزل پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ کیسے ہم اپنی قدیم شعریات سے تازگی وطراوت کشید کر کے اپنے پیرائے کو متنی واسلوبی سطح پر نیا اور پُر تاثیر کر سکتے ہیں۔ ان کی خلاّقانہ مشاقی اور فنی وفکری پختگی کے پیچھے ان کا عمیق مشاہدہ، وسیع مطالعہ، روحانی بصیرت اور گہرا تنقیدی شعور کارفرما ہے۔ ان کے شعر کی سنجیدہ قرأت جب اپنی جمالیات کو اپنے پڑھنے والے پر منکشف کرتی ہے تو ایک ناقابلِ بیان انبساط اور سرشاری کی لہریں باطن میں ہلکورے لینے لگتی ہیں۔ ان کی شاعری سے حاصل ہونے والا یہ وہ نشاطیہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ان کا کلام داد وتحسین سے بھی ماورا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی داخلی دروبست کو معاصر منظر نامے کی پیچیدگیوں سے اس طرح پیوند کرتے ہیں کہ نتیجے میں ان کے ہاں ایک نئے ذائقے کا عصری انسلاکی اظہاریہ صورت پذیر ہوتا ہے جو نہ صرف امکانات سے پُر ہے بلکہ غزل کی متنوع معنوی جہات کے دریافتی عمل پر ہمارے اعتماد کو مزید پختہ کرتا ہے۔

مظہر نقوی 4 فروری 1980 کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ آج کل راولپنڈی میں سکونت پذیر ہیں۔ ذیل میں ان کے چند منتخب اشعار:

منکشف ہے وجود کا جوہر
رمز و رازِ عدم ہے پوشیدہ

ابھی تو صرف دیوانے ہوئے ہیں
ابھی تو صرف دانائی گئی ہے

اُس کو تلاش کون و مکاں میں نہ کیجئے
جو کہہ رہا ہے شہ رگِ جاں سے قریں ہوں میں

قضا و قدر سے رہا کسی بھی پل نہیں ہوئے
ہمارے کچھ معاملے زمیں پہ حل نہیں ہوئے

ایک گرداب تقیر ہے، جہاں بھی دیکھوں
کیا تحیر دلِ بیتاب سنبھالے ہوئے ہے

اک احتیاط پنپتی رہی رویوں میں
تعلقات نتیجوں کی مصلحت میں رہے

رات روزن میں بسر کرتا ہے دل
جاگتی آنکھوں کی ویرانی کیساتھ

غلط ہیں تیرگی کے سارے دعوے
دیوں پر گرد پھیلائی گئی ہے

کیا کیا نہیں ہیں نخلِ جنوں کو سہولتیں
تخمِ خرد کو آج بھی زحمت نمو میں ہے

مرے کوزے کی نکہت خیز مٹی
دیارِ فقر سے لائی گئی ہے

دل توسنِ ہوس کا نہیں ہے سوار، شکر
سیراب و سیرِ لذتِ نانِ جویں ہوں میں

لو بجھ گئی چراغِ شبِ انتظار کی
رم شعلگی کا ساعتِ تحلیل تک رہا

آئینۂ نمود پہ حیرت کا اشتیاق
بے چہرگی سے عکس کی تشکیل تک رہا

اک دن سے اجتناب کی خو بن سے جا ملی
اک شب کی جستجو کا سفر جھیل تک رہا

شوقِ دوامِ آتشِ قلبِ حزیں ہوں میں
نالہ کشِ صعوبتِ زائل نہیں ہوں میں

موجِ بہار خوں سے قبا عطر بیز ہے
خاکِ شفا کے لمس سے روشن جبیں ہوں میں

جہاں تک دشت پیمائی گئی ہے
بہ قدرِ آبلہ پائی گئی ہے

ہوا کی بے ردا تنہائیوں میں
چراغوں کی مہک پائی گئی ہے

اداسی کو کہاں سمجھا گیا ہے؟
دلوں پر چوٹ کب کھائی گئی ہے

گلوں سے ربط کا پردہ سلامت
روش کانٹوں کی اپنائی گئی ہے

کُن سے ہے معرضِ امکان میں ہستی کا ظہور
اک ارادہ سبھی اسباب سنبھالے ہوئے ہے

سب کی قیمت ہے جدا، دام الگ ہیں سب کے
کوئی منبر، کوئی محراب سنبھالے ہوئے ہے

اک تجسس عیاں ہے وحشت میں
اک تحیر کا زم ہے پوشیدہ

یہ راز جوہرِ ہستی کے ارتقا سے کھلا
ہم ابتدا سے ہی دامِ مراجعت میں رہے

ہوائیں شام سے خیموں میں خاک اڑاتی رہیں
چراغ شام سے بجھنے کی کیفیت میں رہے

یہ کھوج ، یہ سفر جو مسلسل لہو میں ہے
مجھ میں کوئی ضرور تری جستجو میں ہے

زخمِ نمود چاکِ گریباں تو بھر گیا
اک آہِ نارسا ہے جواب تک رفو میں ہے

اپنی حدوں سے روشنی ہوتی گئی بلند
سایہ رواقِ حلقۂ قندیل تک رہا

صحرا کو آبلوں کا لہو دے گیا کوئی
خوشبو کا اختیار کئی میل تک رہا

ناوکِ دستِ شقاوت سے چھدی مشکِ امید
اندروں نقشِ غمِ آب سنبھالے ہوئے ہے

آب شرمندہ کو ہے کس کی تمنا مظہر
راز کیا سینۂ سرداب سنبھالے ہوئے ہے

صبح رسا قریب ہے آنکھوں کی شام سے
بجھتے ہوئے دیئے کا اجالا وضو میں ہے

اک تجنس شرحِ لازم سے الگ
اک تغیر رمزِ امکانی کیساتھ

زعمِ قدرِ حُسنِ کنعانی کی خیر
بک رہا ہے کتنی ارزانی کیساتھ

الم دیئے گئے تو کیا، ستم کئے گئے تو کیا
دعائیں رد نہیں ہوئیں، یہ ہاتھ شل نہیں ہوئے

بس اک چراغ بجھایا گیا سرِ خیمہ
پھر اُس کے بعد اجالے مراقبت میں رہے

دیے گئے جو حصارِ دعائے جوشن میں
ہر ایک شر سے یقیناً محافظت میں رہے

خوش مزاجی بھی ہے چہرے پر
دل میں گردِ الم ہے پوشیدہ

چراغ بن کے جل بجھے، وہ گل بہ گل مہک اٹھے
رُتوں کی دھوپ چھاؤں میں جو غم غزل نہیں ہوئے

عالم تمام جذب ہے رقصِ فقیر میں
وسعت تمام دشت کی آوازِ ھو میں ہے

☆☆☆☆☆

لوگ مجھ کو مری فریاد سے پہچانتے ہیں

شاعرِ امروز

اسامہ خالد

شاہد ماکلی

اسامہ خالد کے تخلیقی رویوں کی تشکیل میں نفسیاتی عناصر کی دخل اندازی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ نفسیاتی رجحانات کے پیچ وخم کے نتیجے میں جنم لینے والا اظہاریہ نہ صرف ان کی فکری پیچیدگیوں کی گرہیں کھولتا نظر آتا ہے بلکہ اسے شاعر کی اپنی ذات کی تکمیل وتوسیع کی طرف ہونے والی پیش رفت بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کی غزل ہمارے عہد اور ہماری نوجوان نسل کے داخلی اضطراب، رنجِ رائیگانی، تنہائی، وحشت، ناآسودگی، اداسی، روحانی کرب، الجھنوں اور مخمصوں کی توضیحات کا موثر تمثیلی اور جمالیاتی نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری دہائی میں اردو غزل کے منظرنامے پر سامنے آنے والوں میں اسامہ خالد کی غزل ایک مستحکم آواز کے طور پر کامیابی سے اپنی جگہ بنا چکی ہے۔

اسامہ خالد 6 جنوری 1998 کو کوٹ ادو میں پیدا ہوئے۔ یونیورسٹی آف گجرات سے کیمیکل انجینئرنگ کی ڈگری مکمل کی۔ ان دنوں فاطمہ شوگر ملز سنانواں سے وابستہ ہیں۔ 2018ء میں "سفرزاد" کے نام سے ان کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوکر ادبی حلقوں سے پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ ذیل کا شعری انتخاب جدید حسیات و رجحانات کی غزل کے قاری سے سنجیدہ قرات کا تقاضا کرتا ہے:

کاش وہ بھی قبول کر لیتا
میری بے چہرگی سمیت مجھے

تم ایک بار مجھ کو وہاں تک تو لے چلو
تب تک میں بھول جاؤں گا، کیا چاہیے مجھے

پھر اپنے انہدام کی جانب بصد خلوص
میں بھی روانہ ہوگیا ہر چیز کی طرح

وقتِ وحشت مجھے پہچان نہیں پاتا کوئی
پھر بتاتا ہوں، فلاں شخص کا بیٹا ہوں میں

جاتا ہوں روز گھر کو اداسی کے ساتھ ساتھ
پاؤں جما کے اور کبھی لڑکھڑا کے میں

دیمک کھا گئی منظر کے دروازے کو
مٹی ہو گئے دستک دینے والے ہاتھ

بعض اوقات تو میں خود پہ بہت چیختا ہوں
چیختا ہوں کہ اُدھر جاؤ جدھر کوئی نہیں

ایک دن لوگ مجھے تخت نشیں دیکھیں گے
ورنہ دیکھیں گے، مرا جسم ہے، سر کوئی نہیں

سچ بتاؤں تو مجھے خود سے یہی شکوہ ہے
کیوں کسی بات پہ شرمندہ نہیں ہوتا میں

ہنس پڑا ہوں خود اپنی حالت پر
میں نہ ہنستا تو اجنبی ہنستے

ہر سپاہی سے طلب کیجیے اسبابِ شکست
سارے لشکر میں اکیلا تو نہیں ہوتا میں

ماں کی آغوش سے مٹی میں اتر جانے تک
اتنے آلام ہیں دنیا میں کہ جی جانتا ہے

اتنی رفتار سے جاتی ہے دعا عرش کے پار
جتنی رفتار سے دامن میں خطا آتی ہے

گھر کی تعمیر کو بنیاد سے پہچانتے ہیں
لوگ مجھ کو دلِ برباد سے پہچانتے ہیں

نام تبدیل کرو، شکل بدل لاؤ بھلے
ہم تو ہر زہر کو اجداد سے پہچانتے ہیں

بہت آسان ہے اس دور میں باطل کی شناخت
لشکرِ کذب کو تعداد سے پہچانتے ہیں

میں انھیں نام بتاتا ہوں مگر لوگ مجھے
سر سے لپٹی ہوئی افتاد سے پہچانتے ہیں

دوسروں کے لیے وہ لوگ مسیحا ہوں گے
ہم جنھیں موت کی ایجاد سے پہچانتے ہیں

کتنا یکتا ہے فقیری میں تعارف میرا
لوگ مجھ کو مری فریاد سے پہچانتے ہیں

نہ جانے کیوں مجھے کہتی تھی زندگی میری
کسی پہ خرچ نہ کرنا بچے کھچے مرے دن

ایمان سے بتلائیں تو کیا کچھ نہیں کہتی
کہنے کو ہمیں خلقِ خدا کچھ نہیں کہتی

کرتی ہے فقط مائلِ آوارگی ہم کو
منہ سے تو کبھی گھر کی فضا کچھ نہیں کہتی

ہر موڑ پہ کہتی ہے مجھے میری شرافت
کیا تجھ کو زمانے کی ہوا کچھ نہیں کہتی

دعا سلام سے آگے نکل گیا رشتہ
زمیں مدار سے باہر نکل گئی ہے دوست

تیری آنکھوں نے دکھایا ہے مرا چہرہ مجھے
ایسی گالی تو کبھی آئنے تک نے نہیں دی

یوں بھی نہ ہو ہر ایک کہانی کا اختتام
میں جن ہوں جن رہوں، وہ پری ہے پری رہے

مجھ کو باہر سے جکڑتی ہے قفس کی زنجیر
اور زنجیر کو اندر سے جکڑتا ہوں میں

لے جاؤ مجھ کو مجھ سے مگر ایک بات ہے
لمبے سفر کے واسطے اچھا نہیں ہوں میں

اب وہ زنجیر ہے دل پر، جو کبھی پاؤں میں تھی
کیوں ہمیں شوق تھا وعدوں سے رہا ہونے کا

کہتے تھے راستوں کے شجر چوم کر مجھے
غم کا سفر طویل ہے، آرام مت کرو

جس طرح بھیک میں دیتا ہے محبت وہ شخص
سوچتا ہوں کہ مرے ہاتھ میں کاسہ تو نہیں

گھر سے نکلا تو وہیں چھوڑ دی چابی گھر کی
اور دروازے پہ اک تیر سے دل باندھ دیا

دنیا میں کس کا عشق و مقدر پہ زور ہے
کرنیں اگلتے چاند کی خواہش چکور ہے

آخر کو ہم نے دیکھ لیے خد و خال عشق
چہرے سے ماہتاب ہے، پیروں سے مور ہے

کسی نے نیند پہن لی کسی کی اتری ہوئی
کسی نے خواب اٹھایا کسی کا پھینکا ہوا

لگتا تو یہی ہے کہ زمانے میں ازل سے
سب بانجھ ہیں تنہائی کی دختر کے علاوہ

کچھ رنج ہیں، جنگل ہے، گھٹا ٹوپ خلا ہے
وحشت کے لیے مجھ میں بڑی موزوں جگہ ہے

یعنی یہ خامشی بھی کسی کام کی نہیں
یعنی میں بین کر کے بتاؤں اداس ہوں

میں سفر زاد ہوں اور یہ بھی بتا سکتا ہوں
تیرے چہرے پہ پڑی گرد ہے کس رستے کی

کسی منظر میں ہری گھاس نہیں آتی تھی
اور زردی بھی مجھے راس نہیں آتی تھی

اضطرابی میں خوشی کو بھی تھما آیا طلاق
بسترِ غم پہ مرے پاس نہیں آتی تھی

ایسا گنجان بدن ہوں کہ مرے بیچوں بیچ
دفن تھا ہجر مگر باس نہیں آتی تھی

اُن کے لیے دعائیں جنھیں مجھ سے خوف ہے
خاموش ہوں اور اپنا سفر کر رہا ہوں میں

☆☆☆☆☆

دوہری شہریت

دنیا بھر میں جہاں کہیں ہوں
جس بھی نگر میں رہتے ہوں
اہلِ دل اور اہلِ نظر کی مشترکہ پہچان یہی ہے
لاکھ زباں پر پہرے ہوں یہ
دل کی باتیں کہہ جاتے ہیں
مظلوموں کے غم کی سختی
اپنے اوپر سہہ جاتے ہیں
پر یہ اچھے لوگ ہمیشہ دو شہروں میں رہتے ہیں
ان میں اک تو ہوتا ہے
جس میں ان کے رات اور دن بھی سب
کے ساتھ گزرتے ہیں
دوسرا وہ جو اُن کے دل میں اور تصور میں بستا ہے

جس کی گلیاں، لوگ اور موسم
اس دنیا میں سب سے جدا ہیں
امن، محبت، رستے جس کے
سکّے جس کے، مہر و وفا ہیں
اَن دیکھا یہ شہر وہی ہے
جس خوشبو اور فضا میں یہ دیوانے
اپنے اپنے دل کی باتیں
سُننا، کہنا چاہتے ہیں
جس میں مرنے کی خواہش میں
زندہ رہنا چاہے ہیں

امجد اسلام امجد

نیلام

فلک کب کھل کے برسے گا؟
زمیں کب راز اگلے گی؟
نئے منظر بنانے میں نجانے عذر اب کیا ہے؟
گزرتے وقت نے چہروں کے بخرے کر دیئے ہیں
تن بدن کو پیس ڈالا ہے.....
ہمہ تن گوش ہے دنیا
اذان فجر کا لمحہ نہیں کھنکا.....
.....عشا سے فجر تک کا مختصر وقفہ
کئی صدیوں پہ پھیلا ہے
بلالِ خوش نوا مٹی کی چادر تان کر سویا پڑا ہے
ہم امید و وہم و ایقان و محبت کا لبادہ ہاتھ میں تھامے
خلا میں چل رہے ہیں سب.....
امیدیں، بے فلک، تاریک شہروں میں جبیں
پر جھلملاتی کہکشائیں ہیں
یقیں، سولی پہ آویزاں مسیحا تبسم ہے
تو ہم، مقبرا ہرام میں محشر رسیدہ نیند میں گم،
بادشہ کے دائیں پہلو کی کڑی دیوار پر،
در کا نشاں ہے

اور.....

محبت، ہجر کے موسم کی بادِ نم سے رقصاں شاخ پر
کھلتا ہوا وہ پھول ہے،
جس کو خزاں چھوتی نہیں.....
جس کی ہنسی سے
زرد موسم کی گلابی نکہتوں کی جھانجریں سی
جھن جھناتی ہیں
تحیر پانیوں میں عکسِ کعبہ ہاتھیوں کی
دسترس میں ہے
ابابیلوں کا لشکر سنگ باری کے لیے آنے کو ہے
لیکن
ابھی کنکر نہیں پہنچے.....
ہمہ تن چشم ہے دنیا
طلوعِ فجر کا لمحہ نہیں چمکا.....
امید و وہم و ایقان و محبت کا لبادہ
یاد کا طرہ ہی اپنا کل اثاثہ ہے
مگر اب سوت کے سکے نہیں چلتے
دیارِ انس کے کوئے ملامت میں
فروشانِ لب و رخسار کی بولی زلیخا ہار جائے گی
کہ یوسف خواب کی تعبیر اب نیلام کرتا ہے.....

جمشید چشتی

صبحِ منحرف

پُرسکوں بحرِ بے طلب میں کہیں
ماہِ خواہش کا جھیلنا ہے اُچھال
پھر ہوا صبحِ منحرف کا نزول
سر اُٹھانے لگی نمودِ سوال
وقتِ اظہارِ مدعا آیا
آنکھ میں اُٹھ رہی ہے موجِ زُلال
دل میں اِک بے یقینی پیشِ کلام
نہ بڑھے حد سے اشتیاقِ جمال
نکلے دستِ دعا نہ دستِ دراز
نہ میں محرم نہ واقفِ احوال
چاہیے ایک بوند بارش کی
جس سے معمور ہو لے میرا سفال
کاش رکھ لوں حدودِ منت میں
یہ دعا ہے سخن ہو خیر سگال
پر یہ اندیشہ ہائے بے ہنری
ہوتا جاتا ہے ہر سخن ہی محال
چھوڑیے خامشی ہی بہتر ہے
وہ تو ہے ہی نہیں مقال خصال
ہم نے سیکھا یہی ہے ماضی سے
اپنے منصب پہ خود کو کر کے بحال
ریزہ ریزہ صدا کو چُنتے ہیں
اُسی پہلے خدا کو چُنتے ہیں

حسنین سحر

نظم

رات اُتری ہے

درِ دل پہ کسی یاد کی لو

آشنا لہجے میں امرت کی ڈلی ہو جیسے

ایک سرگوشی کسی شکل میں تجسیم ہوئی

اک صدا نور کے پیکر میں ڈھلی ہو جیسے

ایک تصویر کسی حسنِ نادیدہ کی

لمسِ تازہ ہے کہ پاکیزہ کلی ہو جیسے

ایک انبوہِ پریشاں ہے یہاں صبح و مسا

یہ مری روح محبت کی گلی ہو جیسے

اصغر علی بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ابھی تک آنکھ نم ہے، دل لہو ہے
مجھے کافی مرا پہلا وضو ہے

راز کی باتیں

کسی آشنا نے اک دن
سرِ بزم مجھ سے پوچھا
تجھے روگ کیا لگا ہے
کہ ہے زرد تیرا چہرہ

.....

ترے لب پہ کس لیے ہیں
شب و روز "ہجر نالے"
ترے بال ہیں پریشاں
ترے پاؤں میں ہیں چھالے

.....

تری آنکھ کیوں ہے ویراں
تجھے چین کیوں نہیں ہے
یہ جہانِ آب و گِل تو
کسی خلد سا حسیں ہے

.....

مجھے اس طرح لگے ہے
کہ ہو مات "عشق بازی"
وہ ہے کون؟ جس نے ایسی
تجھے شاعری نوازی

.....

جو سنی یہ بات اس کی
دلِ زار مسکرایا
وہ حسین عہدِ رفتہ
مجھے پھر سے یاد آیا

.....

مری آنکھ میں وہ منظر
سبھی پھر سمٹ کے آئے
وہ جو مہرباں تھے مجھ پر
ترے گیسوؤں کے سائے

.....

اسے کیا مگر بتاتا
بھلا دل کی وارداتیں
اُسے کیا جواب دیتا
کہ ہیں راز کی یہ باتیں

شوکت محمود شوکت

نشانِ عہدِ جہالت

یہ تم نے کیا ستم ڈھایا
مجھے تو شرم آتی ہے تمہیں انسان کہتے بھی
خدا نے تم کو رحمت دی
تو واپس پھینک دی تم نے
نوازا تم کو بیٹی سے
تو اس کو قتل کر ڈالا
یہ سوچا ہی نہیں تم نے؟
ذرا دل میں نہیں آیا؟
تمہیں پیدا کیا جس نے وہ ماں بھی پہلے بیٹی تھی
جو بیوی بن کے گھر آئی، کسی کی وہ بھی بیٹی ہے

ابھی تو پھڑ پھڑائی تھی
وہ ننھی پھول سی تتلی
کہ جس کے نرم ہونٹوں نے ابھی تو
مسکرانا تھا
محبت کے گلستاں میں چہکنا کھلکھلانا تھا
ابھی تو درد سے اس کو
تڑپنا بھی نہ آیا تھا
کوئی تکلیف ملنے پر
تو رونا تک نہ آیا تھا

مگر تیری یہ سفاکی
کہ ریشم سے بدن والی
اسی معصوم تتلی کو
زمیں پر پہلے دے مارا
نشانہ پھر لیا اس کا
چلا دیں گولیاں اس پر
وہ اک گولی کہ شاید
اس کے ننھے منے دل سے بھی بڑی ہوگی
وہ یہ بھی کہہ نہیں پائی
کہ بابا اتنی چھوٹی ہوں
مجھے بس ایک کافی ہے

ذرا سا خون تھا اس میں

سرور حسین نقشبندی

وہ خود بھی تو ذرا سی تھی

ترے بے رحم ہاتھوں نے

اسی معصوم تتلی کو

اسی کے خوں میں نہلایا

یہ کیسے کر لیا تو نے۔۔۔۔۔!

ترے مکروہ چہرے میں

ہزاروں سال پہلے کے

اسی عہد جہالت کا

وہ بدبودار لاشہ پھر

دوبارہ ہو گیا زندہ

کہ بیٹی پیدا ہونے پر

تو وہ بھی اپنے ہاتھوں سے

زمیں میں گاڑ دیتے تھے

تری تاریک ذہنی بھی

اجالے کے زمانے میں

انھی کی اک نشانی ہے.....!

.....

سکوں آور دوائیں

کہیں اک چائے کے کپ میں
کبھی کافی کی پیالی میں
کہیں سگریٹ کے کش میں صرف جاں
کرتے ہوئے
کسی کے خال وخد اک آئینے کے روبرو
خود سے بیاں کرتے ہوئے
لگا کر روگ دل میں ایک ان دیکھی سی چاہت کا
کہیں شب کے کسی پچھلے پہر محسوس کرنا
آتا جاتا جھونکا اک انجانی راحت کا
اکٹھی کرتے رہنا اشیائے بے مقصد ضرورت کی
کسی کونے میں چھپ کر
داستانیں پڑھتے رہنا سب محبت کی
کوئی پنچھی پکھیرو گھر کی چھت پر پال لینے سے
در و دیوار پر ہلکے پیازی کاسنی پھولوں کی
بیلیں ڈال لینے سے
کبھی تنہائیوں کی شاخ سے خاموشیاں چن کر
ہجوم نفس کے صحرا میں چلتے چلتے تھکنے پر
سرائیں ڈھونڈ لیتے ہیں
کسی بھی شکل میں سب ہی سکوں آور دوائیں
ڈھونڈ لیتے ہیں
کہیں اک چائے کے کپ میں
کہیں کافی کی پیالی میں

رخشندہ نوید

راہ کی پہیلی

زندگی بھی مشکل تھی
موت کا طریقہ بھی سوجھتا نہ تھا کوئی
راستہ بھی لمبا تھا
راہ کی پہیلی بھی بوجھتا نہ تھا کوئی
حُسن کے تعاقب میں
عشق کی تمازت تھی
آس کا سویرا تھا
عشق کے تعاقب میں
ہجرتِ مسلسل تھی، ہجر کا اندھیرا تھا

مقدّر کی سوزن کہیں کھو گئی ہے

بوڑھے دروازے کی اوٹ میں
کھری کھٹیا پہ لیٹی ہوئی، اونگھتی ماسی جیونی
سنا ہے!
وہ موذی مرض (جس کو سرطان کہتے ہیں)
میں مبتلا ہو گئی ہے

نہ پیسہ نہ پائی
مگر بجھتی آنکھوں نے امید کی لو جگائی
بڑے ہسپتالوں کے چکر لگانے میں جو جمع پونجی تھی
چھن چھن کے گرنے لگی تھی تو سُدھ بُدھ گنوائی

نمی جذب کرتی ہوئی چھت سے دو ہاتھ نیچے
کئی سال سے بند چھوٹا ہوا دان چڑیوں کا مسکن بنا ہے
یہاں گرتے رہتے ہیں تنکے
گزرتے ہیں رُک رُک کے لمحات دن کے

کمر پر دوپٹہ لپیٹے
ہر اک کونے کھدرے میں جھاڑو لگاتی ہوئی
ماسی جیونی کی پوتی
چمکتی ہے سُرمہ لگی آنکھوں میں آنے والے
نشیلے زمانوں کی جوتی

نشیلے زمانے!
سلائی کڑھائی کی دن رات محنت سے
جن کو جگاتے ہوئے
مدّتیں ہو گئی ہیں
ادھر کپڑوں کی دھجیاں
ایک کونے میں گٹھڑی کی قیدی بنی ہیں
جو مقراضِ قسمت نے کاٹی ہیں ایسے
کسی پیرہن میں سماتی نہیں ہیں
انہی منظروں کے پنگھوڑے میں پلتے ہوئے
ایک ننھی سی گڑیا بڑی ہو گئی ہے
مقدّر کی سوزن کہیں کھو گئی ہے

طالب انصاری

نظم +16

زعیم رشید

.....کالج میں آتے ہی'
یوں لگ رہا ہے کہ جیسے
مرے جسم پہ کوئی پر لگ گئے ہیں
میں بالی عمریا میں ہی
عشقیہ داستانیں بھی پڑھنے لگا ہوں
موبائل کے میسج'
میں کیوں دوستوں سے چھپانے لگا ہوں
گزرتی ہوئی خوبرو لڑکیوں کو
میں چھپ چھپ کے
کیوں دیکھنا چاہتا ہوں
جوانی کی سیڑھی پہ چڑھنے سے پہلے ہی
نیندیں سرکتی چلی جا رہی ہیں
میں اٹھارہ سے پہلے '
کمرے میں چھپ کر
وہ سب دیکھتا ہوں جو ہیجان ہے
جس میں نقصان ہے' اور .....!
اُدھر باپ'
پند و نصیحت کی گٹھری لیے
میرے سر پر کھڑا ہے
اِدھر ماں'
زلیخا کا قصہ سنا کر
مجھے سورہ یوسف کا دم کر رہی ہے
جوانی'
کوئی دھند ہے
جس میں اترے چلا جا رہا ہوں
کوئی دھوپ'
میرے بدن کو جلائے
تو کیا لطف آئے!
محبت'
مرا ہاتھ تھامے ہوئے ہے
مجھے زندگی گنگنانے لگی ہے
مرے خواب'
رنگین ہونے لگے ہیں!!

نظم

اگر تم مل نہیں پائے۔۔۔
جب ایسا سوچتی ہوں میں
تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
اداسی خواب میں ڈیرے جماتی ہے
حقیقت کانپ اٹھتی ہے
یہ کیسا خوف طاری ہے رگ وجاں میں
جو نیندیں چاٹ جاتا ہے
یہ کیسا واہمہ ہے ڈر ہے' خدشہ ہے

اگر تم مل نہیں پائے
تو زندہ رہ سکوں گی کیا؟
میں کیسے سامنا کر پاؤں گی دنیا کے طعنوں کا
مجھے جب یہ خیال آتا ہے
یوں لگتا ہے جیسے جی نہ پاؤں گی
میں مر ہی جاؤں گی شاید
سحر سے شام تک اور شام سے شب تک
شبوں کے سارے پہروں میں
سحر ہونے تلک یہ خوف دامن گیر رہتا ہے
اگر تم مل نہیں پائے۔۔۔۔۔؟؟

فرح شاہد

ذکرِ سکینت

اسی سے ہے قرآں کی زینت خصوصی
محمد کی اس میں ہے مدحت خصوصی

ہماری زبانوں پہ صلِ علیٰ ہے
کہ اس ذکر میں ہے سکینت خصوصی

درِ مصطفیٰ کی ہے چاہت دلوں میں
کہ ملتی وہیں ہے محبت خصوصی

عجب ہے پذیرائی شوق و طلب کی
یہاں سب کو ملتی ہے عزت خصوصی

یہاں جو بھی بنتا ہے مہماں نبی کا
تو ہوتی ہے اس کی ضیافت خصوصی

سبھی انبیا محترم ہیں ولیکن
ملی مصطفیٰ کو فضیلت خصوصی

اسی آس پر جی رہا ہوں کہ مجھ کو
مدینے سے آئے بشارت خصوصی

دکھا دے خدایا مجھے سبز گنبد
ملے حاضری کی اجازت خصوصی

اویس! آؤ جائیں دیارِ نبی میں
وہیں پہ برستی ہے رحمت خصوصی

اویس جمیل

خطوط

آصف ثاقب

بیاض اکرام عمران منظور صاحب ___ السلام علیکم!

'بیاض' حرف حرف خوش نمایاں لے کر پہنچا۔ اب کے علم وادب کے ایسے اسباب جمع ہوئے ہیں کہ 'قربانت شوم' کی آواز دل سے اٹھتی ہے۔ نثر اور شاعری ہمیشہ کی طرح دل کو چھو رہی ہے۔ شاعری میں غزل اور نظم نثر میں مضمون افسانہ اور مزاح بالکل بیاض رقم ہیں۔ علمی اختصاص بھی بہر نوع موثر ہے۔ فنِ رباعی سے متعلق مباحث شروع دن سے رمز افروز اور 'شیوہ طراز' رہی ہیں۔ رباعی کے اظہارات کے پس منظر میں احساسات اور جذباتی ترغیبات کے سامان لاینحل کے امکانات رکھتے ہیں۔

'بیاض' میں رباعی کا اسلوب بیاں حسن وخوبی سے مزین ہے۔ رباعی کہنے والوں نے اس سے خاص طبعی نسبت سے کام لیا ہے۔ رباعی کے اظہارات اہل اعتبار کے نزدیک بحر ہزج سے فروغ ہیں۔ اسی خصوص میں دلچسپ امر یہ ہے۔ امیر الاسلام مشرقی نے رکن مفتعلن (مف تع لن) سے رباعی کے متعلقات وضع کیے ہیں۔ جن کا ذکر ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اپنی کتاب تحقیق کی درستی ''کے مضمون'' اور ان کی رباعی کے متعلق ایک نئی دریافت میں بڑی لگاوٹ سے کہا ہے۔ امیر الاسلام مشرقی نے اخرب اور اخرم اور ان (اظہارات) کے آغاز رکن فع سے کر رکھا ہے۔ بہر صورت یہ ایجاد توجہ طلب ہے۔ ملاحظہ ہو:

اخرب

ارکان مروجہ	ایجاد مشرقی
مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعل	فع مفتعلن، مفتعلن، مفتعلن
مفعول، مفاعیلن، مفعول، فعل	فع مفتعلن، فعولن، مفتعلن
مفعول، مفاعلن، مفاعیلن، فاع	فع مفتعلن، مفتعلن، مفعولان

اخرم

مفعولن، فاعلن، مفاعیل، فعل	فع مفعولن، مفاعلن، مفتعلن
مفعولن، مفعولن، مفعولن، مفعول	فع مفعولن، مفعولن، مفتعلان

ایجاد مشرقی میں سبب کے بعد سبب وقد کے بعد وقد کی لازم شرط موجود نہیں۔ ایک پُر لطف افتاد یہ بھی ہے کہ اخرم کا وزن مفعولن، مفعولن، مفعولن، فع ___ مشرقی کے وزن فع مفعولن مفعولن مفعولن کے برعکس ہے۔ یہ دونوں وزن فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن سے منطبق ہیں۔ اس وزن میں ہندی بحر تاثر موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رباعی کی بحر ہندی طبع شعری سے ایک مقام پر منسلک ہے۔ ہمارے کہنے والے، رباعی کے ''دلدارگاں'' رباعی کے مخصوص اخرب واخرم اظہارات برتتے ہیں۔ 'بیاض' کے ٹائٹل پر رفتگاں کی تصویریں ہیں۔ خالد احمد کی یادیں بدستور ہیں اب اجمل نیازی، روحی کنجاہی اور بشریٰ رحمٰن کے غم سے آنکھیں بہہ رہی ہیں۔ بشریٰ رحمٰن، بلبلِ پاکستان ادبی محفلوں کی رونق رہی تھیں۔ (مرحومہ) نے سیاست میں بھی رنگ جما رکھا تھا۔ روحی کنجاہی کے انتقال کی خبر مجھے اسلام آباد میں غافر شہزاد سے ملی تھی۔ اجمل نیازی کو ہارون الرشید نے بڑے درد بھرے پیرائے میں یاد کیا ہے میں ان سب کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔ چل چلاؤ لگا ہے جانے کب دم مسافر ہو جائے۔ نسیم سحر، ممتاز راشد لاہوری، آفتاب احمد ملک، فیض رسول فیضان، اشرف کمال اور آفتاب خان نے محبت کی نگاہ ڈالی۔ ان کا شکریہ۔ احباب جو یاد کرتے ہیں اور جو نہیں پوچھتے ان سب کی تحریریں سر آنکھوں پر۔ ملاقات کی تمنا رکھتا ہوں بڑھاپا ہے گل محمد ہو کر رہ گیا ہوں۔

خیر اندیش

نسیم سحر

برادرم عمران منظور۔ سلام مسنون۔ بیاض کا شمارہ مارچ ۲ر تاریخ کو موصول ہو گیا تھا، سرورق پر چار عظیم مرحومین خالد احمد، روحی کنجاہی، اجمل نیازی اور بشریٰ رحمٰن کی تصاویر نے ایک مرتبہ پھر رنجیدہ کر دیا۔ اندر کے صفحات پر ان کے بارے میں مضامین بھی ہم سب کے دُکھوں کی ترجمانی کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ جنت کا ذکر کیا تو یاد آیا کہ کل ہی پشاور کی ایک مسجد میں خودکش دھماکے میں ۷۵ سے زائد مسلمان شہید ہو گئے اور ۱۹۰ کے قریب زخمی ہو گئے۔ دعا ہے کہ ان شہید

مسلمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ جنت میں جگہ دے، سوچنے کی بات ہے۔ خود کش حملہ آوروں کو بھی جنت کی ترغیب دے کر ہی ان کارروائیوں کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اللہ انہیں ہدایت دے اور ہمیں ان سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

حمدیہ و نعتیہ تخلیقات میں سے ذیل کے اشعار زیادہ اچھے لگے:

پانچوں حواس آپ کے گھر کے غلام ہیں	سلطانِ پنج در، جو خدم پنج تن تمام	خالد احمد
ہوں پس منظر میں باقی سب مہینے	ولادت کا مہینہ سامنے ہو	آصف ثاقب
مدحِ سرکارِ مدینہ کا ارادہ کرنا	یہ عبادت ہے، عبادت کا اعادہ کرنا	حسن عسکری کاظمی
نعت کہتے ہوئے پہنچا ہے نبیؐ کے در پہ	ذرّۂ خاک ہوا رشکِ قمر آخرِ کار	محمد یٰسین قمر
یہ ٹھان لی ہے فقط ان کی نعت لکھوں گا	رہے گا تذکرہ انہی کی مرا کلام مدام	علی رضا
کسی بھی نعت کی تکمیل ہوتی ہے تو پھر مجھ کو	زمیں سے آسماں تک اک دھنک محسوس ہوتی ہے	سرور حسین نقشبندی

جناب جلیل عالی کی نعت کے گیارہ عمدہ اور مسلسل نعتیہ اشعار پڑھ کر لگا کہ اسے نعتیہ نظم بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح نظموں کے حصے میں جناب اویس جمیل کی نظم "چشمِ رحمت" نعتیہ نظم ہے بہتر ہوتا اگر اسے حمد و نعت کے لیے مختص حصے میں شائع کیا جاتا۔

صفحہ ۱ پر خالد احمد کی نظم "آزاد" جانے کتنے سال قبل لکھی گئی ہوگی مگر آج کے حالات پر بھی پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ حصہ نظم میں شامل نظموں میں سے تنہائی کے لیے لکھی گئی امجد اسلام امجد کی نظم خوب تھی، خالد احمد کی یاد میں جناب خالد علیم کی نظم نے تو دیر تک جکڑے رکھا۔ ان کی نظم کے دو اشعار یہاں ضرور دہرانا چاہوں گا خاص طور پر دوسرا شعر تو اُن کے آخری دنوں میں بھی ان کی شگفتگی کا خوب اعتراف کرتا ہے:

ایسا فن کار کہ گل رنگ ہوئی بزمِ ملون	ایسا گل کار کہ سارا چمن آراستہ تھا
ضعف میں بھی نہ گیا طنطنۂ فکرِ سخن	ضعف میں بھی وہ شگفتہ بدن آراستہ تھا

۲۳ مارچ کے حوالے سے وطنِ پاک کے لیے جناب اعجاز رضوی کی نظم بہت اچھی لگی کہ ایسی نظمیں قاری کے دل میں بھی جذبۂ حب الوطنی تازہ کر دیتی ہیں۔ خاور اعجاز حسبِ معمول جاپانی ہائیکوز کا اردو ترجمہ خوب پیش کر رہے ہیں اس مرتبہ ایک ہائیکو کی تیسری لائن میں انہوں نے اردو میں "گرد سے جاور کا اوڑ" کی جگہ پنجابی کا مصرع استعمال کیا ہے "گردے ہور دا ہوڑ"۔ بہتر ہوتا کہ اس ہائیکو کے پہلے دو مصرعے بھی پنجابی میں ہی ڈھالے جاتے۔ خاور اعجاز جیسے زرخیز شاعر اور دوست کی شعری وسعت و توضیحات کے لیے یہ کوئی مشکل نہ تھی۔ بہرحال یہ اعتراض نہیں، مشورہ ہے۔ اور میں بھی پنجابی زبان میں یہی کہتا ہوں کہ اگے اوہناں دی مرضی!

اب حصہ غزل میں سے کچھ چیدہ اشعار:

میرے ناقد، میں کوئی موم کا پتلا تو نہیں!	کوئی کس طور مرے قد سے گھٹا دے مجھ کو	خالد احمد
خوبیاں ناقدِ فن کیوں دیکھے	وحشت کی آنکھ چمن کیوں دیکھے	خالد احمد
ہے اس میں کسی دیکھنے والے کی خطا کیا	لگ جاتی ہے بندے کو خود اپنی ہی نظر بھی	محمد ارشاد
نیا پن ڈھونڈتا ہوں میں خیالوں کے تناظر میں	اسی احساس کے صدقے کوئی ابہام ہو جائے	آصف ثاقب
برہم ہوئی ہوا تو بچے گا نہ قصرِ شاہ	اس کو تو ایک اینٹ ہلانی ہے اور بس	جلیل عالی
میں شجر کا دکھ بتا سکتا ہوں اطہر	میں نے اس کے زرد پتے کو پڑھا ہے	ممتاز اطہر
اگرچہ ایک ہی کمرہ ہے میرے حصے میں	مجھے ملی ہے مگر سارے گھر کی بے چینی	ناصر علی سید
ہم دونوں اس کے عشق میں برباد ہیں مگر	مجھ میں، رقیب میں قد و قامت کا فرق ہے	مقصود صدیقی رضی
جس روز ہم ادھر سے ادھر ہو گئے کہیں	ڈھونڈے گی پھر ہمیں یہی دنیا ادھر ادھر	حسن عباس رضا
سوچا ہے کبھی میرے علاوہ بھی کسی نے؟	جائیں گے کہاں ارض و سماوات بدل کر	راحت سرحدی
اب اس کے جسم پہ چھاؤں کی ایک دھجی ہے	جو دھوپ اوڑھ کے پھرتا رہا جوانی میں	جمشید چشتی
خوب سے خوب تر کی خواہش میں	ہم مقدر سے ہاتھ دھو بیٹھے	ارشد شاہین
ہجر کے عشق کی کھڑتال دل سے دھوپ نکال	دھمال ڈال قلندر، بہت اندھیرا ہے	علی ارمان
یہ خواب جگنو ہیں، راتوں کو کام آتے ہیں	سوال کو دن میں پکڑنے کی کیا ضرورت ہے	طالب انصاری
نہیں کچھ فائدہ بے فیض لوگوں سے محبت کا	ہمیں بنجر زمینوں میں شجر کاری نہیں آتی	ریاض ندیم نیازی
اپنی سانسوں کا الاؤ راکھ کرتا ہے مجھے	آگ اس گھر میں لگا دیتا ہے کوئی اور بھی	محمد نوید مرزا

پتھر اٹھائے پھر رہے ہیں لوگ شہر میں　اور کہہ رہے ہیں آئنہ خانہ عزیز ہے　آصف شفیع
اور کیا رہ گیا خوش رہنے کو باقی اصغر　میں فقط شعر کی مستی لیے خوش رہتا ہوں　اصغر علی بلوچ
اس پہ ہنستا ہے بہت سا ماتم　بس پڑا تیرا رُلایا ہوا شخص　رضوان قارص
صغیر کیسے بتائیں اس کو بدن ہمارا　ہے بائیں جانب سے اب بھی خالی جناب عالی　صغیر احمد صغیر
وہ بارشوں سے بھرے پانیوں کے برتنوں کو　لبوں سے چھو کے طہورہ کشید کر دے گی　دانش عزیز
یہ الگ بات ہے تم آئیں نہیں سن سکتے　جب بھی چلتی ہے کہیں آری، شجر بولتے ہیں　اسد رضا سحر
تمہارے لیے کھیل ہے روٹھ جانا　مری عمر بھر کی کمائی گئی ہے　راحیلہ عبدالقیوم
کم سے کم شور مچاتے ہوئے طائر نعمان　گھر میں تنہائی کا احساس مٹا دیتے ہیں　نعمان منظور
تیرا چپ رہنا مرے ذہن میں کیا بیٹھ گیا　اتنی آوازیں تجھے دیں کہ گلا بیٹھ گیا　تہذیب حافی
یہ کوزے تو یونہی خالی پڑے ہیں　تو اتنی دیر سے کیا بھر رہا ہوں؟　سعید شارق

نثری حصے میں جناب محمد ارشاد کا مضمون "چلتے چلتے" نے دیر تک اپنی طرف متوجہ کیے رکھا۔ کئی موضوعات پر انہوں نے بظاہر چلتے چلتے لکھا ہے مگر قاری ان کی پُرخیال باتوں پر بار بار رُک کر غور کرتا جاتا ہے۔ انہوں نے ادب سے لے کر سیاست تک بہت سے موضوعات پر جو لکھا ہے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ رانا سعید دوشی نے ممتاز شاعر اور افسانہ نگار تبسم ریحان کے افسانوں کے مجموعے "الجھے دھاگے" پر مضمون لکھ کر مضمون نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ جناب اعجاز رضوی نے شاد محمد سبطین شاہجہانی کی بچوں کے لیے نظموں کی کتاب "لو ہو گیا سویرا" پر مختصر مگر بھرپور مضمون لکھا ہے۔ جناب حامد یزدانی کا افسانہ "کوئے" جدید انداز کا ایک بہت ہی کمال کا افسانہ ہے۔ اسی طرح جناب عزیز عادل کا افسانہ "پیر کا سایہ" بھی روایتی انداز کے افسانوں سے ہٹ کر تھا۔

کسی قدر طویل اس خط کو مزید طوالت سے بچاتے ہوئے صرف اس بات پر اظہار حیرت کرتے ہوئے تمام کرتا ہوں کہ اس شمارے میں محترم جمیل یوسف جیسا باقاعدہ لکھنے والا اور مسلسل و دل فگار کہیں نہیں دکھائی دیا، ورنہ وہ نثری و شعری تخلیقات کے علاوہ حصہ خطوط میں بھی ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔ یہ غیر معمولی غیر حاضری کسی قدر پریشان کن ہے۔

آفتاب احمد ملک

برادر محترم عمران منظور صاحب!

سلام نیاز مندانہ

راقم الحروف تہِ قلب ممنون ہے کہ مارچ کا رنگین معلوماتی، معیاری اور دلچسپ تحریروں کا عکاس 'بیاض' بروقت موصول ہوا اور بقول ممتاز شاعر امتیاز الحق امتیاز منظوم خراج تحسین تمام قارئین و اہل قلم کی قلبی واردات کے بولتے اشعار یعنی شکریہ تمام:

دل کے ورق ورق پہ رقم ہے آپ کا نام　موجود ہے 'بیاض' کا پانی 'بیاض' میں
لفظوں سے آ رہی ہے کسی زلف کی مہک　کھلنے لگی ہے رات کی رانی 'بیاض' میں
نم خوردہ کیسے ہو گئے کاغذ حیات کے　گر نے نہیں دیا کبھی پانی 'بیاض' میں
(صفحہ نمبر 123)

23 مارچ کے حوالے سے برادرم اعجاز رضوی کی وطنیہ نظم خاص اہمیت کی حامل ہے۔

تیرے باغوں میں خوشبو کے انبار ہیں
تیری گلیوں میں رونق کے بازار ہیں
ناز کرتی ہے تجھ پہ مری زندگی
اے وطن! اے محبت بھری سرزمیں!
(صفحہ نمبر 20)

چند بیوروکریٹس افسران کی آپ بیتیاں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ڈی سی نامہ محمد سعید شیخ (2004) ڈپٹی کمشنر کی ڈائری، ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی (2000) بیمثل کی ڈائری، (2019)

اور اسی کے خالد کی "فرو حیات" (اکتوبر 2006) جو اس یادہ و شاعرانہ لفظی شاہ داستان میں استعمال کی گئی ہے۔ شوکت علی شاہ صاحب کی تخلیقی صلاحیتوں کا برملا اعتراف کیا جاتا ہے۔ موصوف نے اس قسط میں چند مثالی کرداروں کے شخصی خاکے لکھ کر کمال کر دیا۔ وہ ان مرد...

عجیب و غریب رونما ہونے والے عوامی و سرکاری واقعات اعلیٰ ذمہ دار افسران کے لیے چیلنج ہوتے ہیں۔ شاہد جی ماہر نفسیات بھی ہیں جنھوں نے سیاسی حکومتوں اور سیاسی پارٹی گروں کے مابین امن و امان، صلہ رحمی اور انسان دوستی کا علم بلند کیے رکھا۔ شاہد داستان عام و خاص حساس قارئین اور نوجوان اپرنٹس افسران کے لیے گائیڈ لائن بھی ہے۔ سال گزشتہ اہل قلم کے لیے ستم گر ثابت ہوا۔ زیر نظر شمارہ میں ''بے نیاز یاں'' کے معروف کالم نگار محب الرحمٰن دلیر شاعر و محقق ڈاکٹر اجمل خان نیازی اور زود نویس ادیب بشریٰ رحمٰن کا انتقال مارچ کے بیاض کے فرنٹ ٹائٹل پر مستقل بچھڑنے والوں کی نہ بھولنے والی یادگار تصاویر یہ تبسم کرتی نظر آتی ہیں۔

جلیل پاکستان کے عنوان سے ناصر بشیر + محمد شعیب مرزا صاحبان کے تحریری مضامین بھی پڑھے۔ برادرم ہارون الرشید نے ڈاکٹر اجمل نیازی (مرحوم) پر جو مضمون تحریر کیا دیگر ممتاز ادبی شخصیات کی وفیات کا بھی تذکرہ کیا۔ رب العزت (مرحومین) کو غریق رحمت کرے۔ آمین ثم آمین۔

دیکھتے ہی دیکھتے سب کشتیاں اوجھل ہو گئیں
اور ساحل پہ فقط لہروں کے سرگرم رہ گئے

پروفیسر نسیم عادل

برادرم محمد ارشاد نے 'بیاض' کے فروری کے شمارہ پر تفصیلی مضمون / تجزیہ تحریر کیا ہے۔

(چلتے چلتے، صفحہ نمبر 28-21) شخص خاکہ نگاری کے صفحات پر محمد افتخار شفیع نے الف۔ د۔ نسیم پر۔ شاعری علی شاعر نے صائمہ اسحاق پر۔ رانا سعید دوشی نے نسیم ریحان کے افسانے کے حوالے سے جدیدیت / مابعد جدیدیت پر ناقدانہ تنقیدی جائزہ لکھا۔ تسنیم فردوس صاحبہ نے مرزا اسد اللہ غالب پر محققانہ مضمون تحریر کیا ہے۔ غزل کے موضوع پر خاص خوبصورت تحریروں پر مبنی مضمون ہے۔ (صفحہ نمبر 56-53)۔ اعجاز رضوی صاحب نے محترم شاہد محمد سبطین شاہجہانی صاحب پر تحسینی نوٹ لکھا بلکہ لو ہو گیا سویا کی تعارفی تقریب میں بھی پڑھا گیا اور ہماری معلوماتی لائبریری میں اضافہ کے لیے تذکرہ، مارچ کے شمارہ میں شامل کیا گیا۔ (صفحہ نمبر 58-57) غزلیات کے نئے عنوانات سے بھرپور اشعار نذر قارئین ہیں:

نیا پن ڈھونڈتا ہوں میں خیالوں کے تناظر میں	اسی احساس کے صدقے کوئی ابہام ہو جائے	
مرے اشکوں کی جھلمل کے یہ دو عنوان ہوتے ہیں	جہاں کشمیر ہو جائے وہاں آسام ہو جائے	آصف ثاقب
ہجر سمندر، وصل کا لمحہ، کیسے ماپ سکیں!	اپنا اپنا پیمانہ ہیں ہم اور تم اور وہ	امجد اسلام امجد
عالی طلب نہیں ہمیں مال و منال کی	کافی کمال حرف و معانی ہے اور بس	جلیل عالی
سفر میں ہمسفر منزل بھی ہو گی	مجھے نسبت رہی بانگ درا سے	حسن عسکری کاظمی
دریا تو نسیم اس کی دہلیز تک آیا تھا	پیاس نے مگر پھر بھی گاگر نہ بھری اپنی	تسنیم سحر
ڈر رہا ہوں آنے والے موسموں سے	کس نے دیواروں پہ لکھے کو پڑھا ہے	ممتاز اطہر
جنھیں شعور آب عزیز تھا، وہ سفر نصیب چلے گئے	کوئی ساحلوں پہ پکارتا رہا، کشتیاں نہیں کھولنا	محمد انیس انصاری
زیور جبر میں ترمیم ہو نہیں پاتی	ریاضتوں کا مسئلہ عمر بھر کی بے چینی	ناصر علی سید
ہم دونوں اس کے عشق میں برباد ہیں مگر	مجھ میں، رقیب میں قد و قامت کا فرق ہے	صفدر صدیق رضی
آج اگر گلزار ہیں باقی ان کی قدر کرو	کل مت کہنا جیتی کو ہر دریا برد ہوئے	گلزار بخاری
ہم بھی تو انھی وحشی درندوں کی طرح ہیں	جو گھات لگاتے ہیں مقامات بدل کر	راحت سرحدی
چلو کچھ تو گرانی روکتے ہیں	کہ جو بازار میں اتوار والے	
جنوبی سمت کی بھولیں نہ راشد	ہمارے دوست پوٹھوہار والے	ممتاز راشد لاہوری
تو نے لوگوں کی بددعائیں لیں	میری ساری دعاؤں میں گزری	
اس دیے کا مزاج پوچھتے ہو	جس دیے کی ہواؤں میں گزری	ہارون الرشید
یہیں کے عشق کے کشکول دل سے دھوپ نکال	دھمال ڈال قلندر بہت اندھیرا ہے	
میں ایک مصرع میں سمجھاتا ہوں اندھیرا تمھیں	سوائے اللہ اکبر بہت اندھیرا ہے	علی ارمان
یہ سمندر ہے سمندر، کون بدل سکتا ہے	میرے دریاؤں کا رخ کون بدل سکتا ہے	ناصر بشیر
ہر ایک باب میں اک درد بانٹ کرتا تھا	میں رو پڑی تھی اسے داستاں سناتے ہوئے	شبہ طراز
کوئی تو بات ہے ایسی جو کہہ نہیں سکتی	وگرنہ ہم کو بچھڑنے کی کیا ضرورت ہے	طالب انصاری

سوچتا ہے سوچتے چلے جانا	طرح دیوانگی نہ ڈال اے دل	افشاں سجاد
یاروں کا سجاتا ہے سرِ شام یوں میلہ	جیسا کہ کوئی حلقۂ یاراں ہوا دل بھی	شوکت محمود شوکت
زبان و لفظ پہ رکھتا ہے ہر صورت گرفت اپنی	کہ محفل میں کسی کی بھی دل آزاری نہیں کرتی	ریاض ندیم نیازی
تلاشِ رزق سے لوٹے ہیں یہ پرندے بھی	تھکے ہوئے سے جو تھک کر اڑان بیٹھے ہیں	افروز رضوی
میں ان کے لیے ایک غزل لکھنے کا خواہاں	وہ ایسے کہ مرے ہوش اڑانے میں لگے ہیں	ذکی طارق
جنگلوں کی طرف نکلتا ہے	ہو گیا سارا شہر سودائی	فوزیہ تبسم
تو مضافاتی علاقے کا ہے بنجارا میاں!	تیرا ساگر میل کیا لاہور کی رانی کے ساتھ	محمد سلیم ساگر
بدل رہی ہے کئی رنگ آسمان کی چھت	سفید، سرمئی، نیلا کبھی یہ نیلی ہوئی	رخشندہ نوید
ایک میں ہوں کہ مرے ہاتھ میں خالی اب تک	ایک تو ہے کہ ترے ہاتھ سمندر آئے	اشرف کمال
محبتوں سے مشورہ کرنا پڑے گا دوستو!	امتحان عشق ہے اور اپنی تیاری نہیں	اظہر حسن
تیرا ہر سال اک کہانی ہے	میرا لمحوں میں بھی شمار نہیں	
زندگی سے فرار ممکن ہے	ہجر کی راہ سے فرار نہیں	عمران اعوان
تکبیر کے کواڑ پہ دستک تو دو ذرا	ہر آگہی کا طاق ہے پارے کی آنکھ میں	ساگر حضور پوری
چھپ رہی ہے غزل آفتاب کے دم سے	غزل گروں میں اسی کی نوا کا موسم ہے	آفتاب خان
انہی قبیلوں میں اپنا شمار ہے سعید	کہ جو چراغ کی لو میں دھواں اتارتے ہیں	ثمینہ سید
ایک بھی خواب نہیں زندہ میری آنکھوں میں	آپ کی آنکھوں میں تدفین ہوئی سب کی ہوئی	اسد اعوان
پھسلتا جاتا تھا وہ ہاتھ میرے شانوں سے	قریب کر کے سکھاتا تھا شاعری مجھ کو	عنبرین خان
ہم نے دیکھا ہے جو آنکھوں سے وہی لکھتے ہیں	حق ہی بولا ہے کبھی زرد صحافت نہیں کی	وسیم جبران

خاور اعجاز بھائی نے اپنی فکر انگیز و معنی خیز غزل میں اردو کے معروف شعرا میر، ذوق، حضرت داغ، اقبال اور ظفر اقبال کا تذکرہ کیا ہے۔ غزل کا آخری شعر:

خود کو آزاد سمجھ بیٹھے ہو لیکن خاور — کسی دیوار میں چنوائے ہوئے لگتے ہو

شاہد ماکلی ہر ماہ دو نئے شعرا کو متعارف کراتے ہیں یہ ان کا بڑا پن ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں تمام شعرائے کرام کی غزلیات و نظمیں خوبصورت استعاروں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ دو اشعار نعمان منظور کے دیکھیے:

رنج کی اوس میں بھیگے ہوئے معصوم حروف — میرے ہر شعر کو شہکار بنا دیتے ہیں
اب امیدوں کے چراغ کا بھرم ٹوٹ چلا — پھر بھی چھوڑیں تو مرے یار بجھا دیتے ہیں

نظموں کے عنوانات نظم گو شعرا کی تخلیقی توانائیوں کا پتہ دیتے ہیں۔ اس بار آٹھ نئی کتب کے فرنٹ ٹائٹلز دیکھ کر مصنفین و مرتبین کی اشاعتی کاوشوں کی داد دی جاتی ہے۔

12 خطوط نگار دوستوں کی تنقیدی سطور پڑھ کر بے پایاں ادبی مسرت ہوئی کہ ماہنامہ بیاض کی تمام تحریروں کی گہری نظروں سے تلاوت کی جاتی ہے جس کے غماز یہ خطوط ہیں۔ احباب کی خیر و عافیت اور ماہانہ رابطے کا ذریعہ بھی خطوط ہیں۔

'بیاض' کی انتظامیہ کمال محنت و محبت سے 241 صفحات اشاعتی منزل سے گزار کر قارئینِ ادب کی تعمیری و تنقیدی جائزے کے لیے بروقت پوسٹ کر دیتے ہیں۔

بہاریہ موسم کی آمد پر خاور اعجاز کے رنگ برنگے مختصر طویل بحروں میں اشعار حساس دکھی رگ کو چھیڑنے سے باز نہیں آتے۔

پر پھیلائے مور — سرسبزی کے موسم کو — کر دے بور را ہو (صفحہ نمبر 19)

مارچ کا شمارہ دکھ بھری کہانیوں، موسمی پیشگوئیوں، رنگ برنگی تحریروں کا مرقع ایک ماہ کا تخلیقی راشن، انتظامیہ دلی مبارکباد کی مستحق ہے۔

خالد علیم کی منظوم (خالد احمد کی یاد میں) خراجِ تحسین

محفلِ خوش نفساں میں وہ رہا قہقہہ بار
دل پہ پہاڑ رنج و محن آراستہ تھا
شاخ در شاخ یہ کیا ڈھونڈ رہے ہو خالد
ایک وہ تھا تو یہ سارا چمن آراستہ تھا

ممتاز راشد لاہوری

مدیرانِ محترم (ماہنامہ بیاض، لاہور)
آداب و تسلیمات
'بیاض' (مارچ 2022) بدست و نظر نواز ہوا۔ سرورق پر ان چار نامور اہلِ قلم کی تصاویر دیکھیں جو (مرحوم) ہو چکے ہیں۔ ایک اداسی کی لہر نگاہوں میں لہرا گئی۔ ان میں سے بشریٰ رحمٰن اور روحی کنجاہی تو ابھی حال ہی میں (فروری 2002) میں فوت ہوئے ہیں۔ اللہ انھیں روح کی آسودگی بخشے۔ سرورق کے اندرونی کتب کے ٹائٹلز کے عکس دیکھے۔ جاشبہ نئی کتب اچھے طباعتی معیارات اور خوشنما سرورق کے ساتھ آ رہی ہیں۔ زیادہ تر کا مواد بھی معیاری ہے۔ 'بیاض' کا یہ شمارہ بھی رنگا رنگ تحریروں کا مجموعہ تھا۔ حمد و نعت میں حسن عسکری کاظمی، جلیل عالی اور سرور حسین نقشبندی کے علاوہ عقیدت کی شاعری میں تسنیم سحر اور پروین کنول کا کلام عمدہ تھا۔ خاور اعجاز کے ہائیکو اور اعجاز رضوی کی ملی نظم نے بھی لطف دیا۔ مضامین میں محمد ارشاد نے گزشتہ شمارے کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ اعجاز رضوی نے بچوں کے ادب کے حوالے سے جلیلین شاہجہانی کی کتاب پر جو تحسینی نوٹ لکھا ہے اور کتاب 'لو ہو گیا سویرا' کو جس طرح متعارف کروایا ہے وہ خود قابلِ تحسین ہے۔ نامور ادیب اشتیاق احمد (مرحوم) کی یادیں بہت اچھے انداز میں لکھی ہیں۔ شوکت علی شاہ کی آپ بیتی کی موجودہ قسط بھی رحیم یار خان کے حالات و شخصیات کے بارے میں تھی۔ کچھ کا ذکر تو خاکہ نگاری کی عمدہ مثال جیسا رہا۔ وہاں ابوظہبی کے حکمران شیخ زید بن سلطان النہیان کے شکار کے لیے قیام کا ذکر آیا تو کئی نئے پہلو سامنے آئے اور حکمران کے پورے حالاتِ زندگی بھی آ گئے جو باعثِ حیران کن تھے۔ غزلوں کے صفحات پر چند مشق شعراء کے ساتھ نو مشق شعراء و شاعرات کا کلام پڑھا۔ کم و بیش ہر غزل میں ایک دو شعر دامنِ دل کو 'کھینچا' مارتے رہے۔ نظموں والا حصہ بھی جاندار تھا۔ طنز و مزاح اور خاکوں والے صفحات نے بشاشت و بہجت سے معمور کیا۔ خطوط کے صفحات بھی لاجواب رہے۔
خیر اندیش

ہارون الرشید

عزیزی جناب عمران منظور و نعمان منظور!
'بیاض' ایسا بے مثال جریدہ ہے، جو ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں باقاعدگی سے اپنی اہمیت کا بھرپور احساس دلاتا ہے اور مجھے بھی اس کے آنے کا انتظار رہتا ہے۔ محمد ارشاد کی تحریریں علمی تجزیہ کا عمدہ نمونہ ہوتی ہیں۔ "چلتے چلتے" بظاہر ایک تنقیدی خط ہے لیکن اس میں انھوں نے چند موضوعات کی اتنے دلنشین انداز سے تشریح کی ہے کہ لطف آ گیا۔
"شاہ داستان" تو ویسے بھی نہایت دلچسپ اور سنسنی خیز حالات و واقعات کا مرقع ہے۔ خصوصاً اس میں مصنف نے ہماری ملکی سیاست کی جس طرح عکاسی کی ہے اسے دیکھ کر قاری سکتے میں آ جاتا ہے۔
بشریٰ رحمٰن کی شخصیت پر ناصر بشیر اور محمد شعیب مرزا نے مختصر مگر دل پذیر مضامین تحریر کیے ہیں۔ نسیم سحر نے فرحت عباس کی شخصیت کو نہایت شگفتہ انداز میں قارئین کے سامنے رکھا ہے۔ اور چٹپٹے جملوں سے اس میں دلچسپی پیدا کر دی ہے۔
علی رضا احمد کا "چٹکلوں کا سردار" میں مزاح کی ہلکی پھلکی جھلکیاں اچھی لگیں۔ ان کے اندر ایک باصلاحیت مزاح نگار کے جراثیم نظر آتے ہیں۔
خالد علیم نے اپنی نظم میں خالد احمد کو جس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے اس پر وہ داد کے مستحق ہیں۔
خالد احمد نہایت وسیع النظر اور نفیس شاعر تھے۔ آپ نے 'بیاض' کو ان کی شاعری اور یادوں سے مہکا رکھا ہے۔ آپ نے ان سے محبت کا خوب حق ادا کیا ہے۔
محمد انیس انصاری کی علالت کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے ان کی جلد شفایابی کے لیے دعا گو ہوں۔ تمام دوستوں اور احباب کے لیے نیک تمنائیں۔

فیض رسول فیضان

مخدومی و محترمی جناب عمران و نعمان صاحبان! آداب و تسلیمات!
مارچ کا 'بیاض' اپنے ٹائٹل پر فکر انگیز شخصی بالغ نظری لیے تشریف آور ہوا۔ حضرت خالد احمد کو دیکھ کر ان کے شہرۂ آفاق شعر یاد آئے:

ترکِ تعلقات پہ رویا نہ تو نہ میں — لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تو نہ میں
کوئی تو روئے لپٹ کر جوان لاشوں سے — اسی لیے تو وہ بیٹوں کو مائیں دیتا ہے

روحی کنجاہی (مرحوم) کی تصویر سے ان کے لازوال شعر تازہ ہوئے:

حقیقت سب کے لب پر ہو گی لیکن — مرا لہجہ مرا لہجہ رہے گا
خبر مجرم لایا ہوں روحی — چور چوروں کے ہاتھ کاٹیں گے

ڈاکٹر اجمل نیازی، میرے اُستادِ گرامی، قبلہ پروفیسر سید منصور احمد خالد کے کلاس فیلو تھے۔ اخباری کالم کو انشائیہ بنانے کے فن کے، نیازی صاحب بے تاج بادشاہ تھے۔ نیک نام، باکردار سیاستدان، اور جگنو محسن، اور متحمل ادیبہ محترمہ بشریٰ رحمان کا وجود، لاکل مکمل شاعرات کے جم غفیر میں نعمت عظمیٰ کا مترادف تھا۔ لفظ جگنو محسن سے اپنا ایک شعر یاد آ گیا ہے:

خالی کاغذ پہ جو اصلاح لیا کرتے تھے　　آج فیضان وہ اُستاد بنے پھرتے ہیں

پاک پروردگار مالک و مولا جل مجدہٗ الکریم اپنے محبوب پاک صلی اللہ علیہ والہٖ واصحابہٖ وسلم کے طفیل، مذکورہ چاروں مرحومین کی مغفرت فرمائے (آمین)۔
حصہ خطوط کے حوالے سے میں آپ جناب کی فراخدلی کو سلام نیاز پیش کرتا ہوں کہ مفصل تبصرے چھاپ کر آپ لوگ اہل قلم خصوصاً شعرائے کرام پر احسان عظیم فرما رہے ہیں "مین آف دی میچ" کے لطیف چٹکلے سے میری رگ ظرافت بھی پھڑک کر یوں گویا ہوئی کہ "بعض مبصرین، خالی مپ سے صفحات ضائع کر جاتے ہیں" تخفن برطرف، حقیقت یہ ہے کہ منتخب اشعار کی مکرر اور حوصلہ افزا اشاعت سے شاعروں کو تسکین مہیا ہوتی رہتی ہے۔ دیل ڈن سر اور تھینک یو ویری مچ۔
محترمہ پروین گل کو مجموعہ تازہ "رفو" کی اشاعت پر دلی مبارکباد۔ رانا سعید دوشی غزل کے بغیر جلوہ فرما ہیں سو فرحت، تشنگی لیے ہوئے ہے۔ حضرت ارشاد صاحب کا عمیق و بلیغ مضمون "چلتے چلتے" ادب و انشاء، صداقت و لطافت، تاریخ و تہذیب، تنقید و تحقیق، شعر و سخن اور سیاسی موشگافیوں کا مسرور کن مجموعہ ہے۔ ان کی خدمت میں اپنا ایک عاجزانہ تحسینی شعر پیش کرتا ہوں:

فلسفے میں حضرت ارشاد سی گہری نظر　　آج کے اس دور میں فیضان کس کے پاس ہے

نعمان منظور صاحب کو سلیس، رواں دواں اور پر تاثیر غزل کے ساتھ دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ موصوف کے لیے ارمغانِ محبت:

فیضان حق سے، میری دعا ہے　　ٹھہریں شاداب، نعمان منظور

یہ خوشنما تحسین بجا ہے کہ "بیاض" کی وسعت اور ہمہ جہتی کی بدولت، اس پر ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے کئی مقالے لکھے جا سکتے ہیں۔
حسب روایت زیر نظر شمارے کے بھی بیشتر مندرجات و مشمولات، خوب و مرغوب ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ فکر و فن، نظم و نثر اور صنف و ہیئت کے حوالے سے بھی "بیاض" جیسی متنوع رنگا رنگی، کسی ادبی معاصر میں ڈھونڈے سے نہیں مل سکے گی۔
خوش ذوق قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے گذشتہ شمارے کا مسحور کار اور شاداب تر شعری انتخاب:

میں ترا بندۂ بے دام ہوں میرے مولا	تو ہے مالک میرا، میں کیسے کروں گا انکار	حسن عسکری کاظمی
نظر میں نور بھر دے سبز گنبد	عقیدت کا نگینہ سامنے ہو	آصف ثاقب
قلم تازہ کے لیے وقت اکثر	اُس کی دہلیز پہ بیٹھا ہوتا	جلیل عالی
غیر بھی آئے اسے اپنا بناتا ہو گا	اُن کی تعلیم ہے دل اپنا کشادہ کرنا	حسن عسکری کاظمی
آپ آئے ہیں زمانے میں اُجالے لے کر	ہو گیا ختم اندھیروں کا سفر آخر کار	محمد یٰسین قمر
کرم نبی کا سدا میرا دستگیر رہا	ہر امتحاں میں رہا ہوں میں شاد کام مدام	علی رضا
خدا کا شکر ہے میں خاکدانِ ہستی پہ	غلامِ سید ابرار ہو کے آیا ہوں	اعجاز دانش
گلشنِ دل کو اگر رکھتا ہے تو نے آباد	پھول آقا کی محبت کے کھلائے رکھنا	محمود کیفی
تیسیں تلاش کہاں کروں کوئی دلیل میں؟	اُس ذات پاک کو ہے ضرورت کہاں دلیل	تسنیم عمر
سب سے عظیم تر دُعا، صلِّ علیٰ محمد	اُن پہ درود بھیجنا، صلِّ علیٰ محمد	مرزا آصف رسول
ہر موزم ہوا / لاتعداد پہاڑوں میں	/ اک مندر تھا	خاور اعجاز
اے وطن اے محبت بھری سر زمیں	تیرے جیسا کوئی اور خطہ نہیں	
تیری چوکھٹ پہ رکھی ہے ہم نے جبیں	اے وطن اے محبت بھری سر زمیں	اعجاز رضوی
جلوۂ یار عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھی	ہر جگہ اُس کا نشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا	الف۔ د۔ نسیم
ہمارے رُخ پہ جو رنگِ جمال ٹھہرا ہے	کسی کے حُسنِ نظر کا کمال ٹھہرا ہے	
اک اسی بات پہ بچھڑے نہ سمائے ہم بھی	شکر صد شکر تمہیں یاد تو آئے ہم بھی	صائمہ اسحاق
بہت ہی مضطرب میرا بدن ہے	مجھے رقاص ہونا چاہیے تھا	تبسم ریحان
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا	درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا	غالب

جہاں دودھ کی دیکھتا ہوں کڑاہی	وہیں بیٹھ جانے کو جی چاہتا ہے	
جہاں ہو نہ پونی نہ تالاب کوئی	وہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے	شاہ محمد سبطین شاہجہانی
میرے ناقد میں کوئی موم کا پتلا تو نہیں	کوئی کس طور میرے قد سے گھٹا دے مجھ کو	خالد احمد
ہر چند ظفر کا ہے وسیلہ تو سفر بھی	وہ بھول گئے گھر کی، رہا یاد نہ گھر بھی	
شے کوئی بھی خالص نہیں دنیائے دنی میں	ہے شر میں اگر خیر تو ہے خیر میں شر بھی	
ایسا نہیں دن کوئی جو گذرا نہ ہو بے شام	ایسی نہیں شب کوئی، نہ ہو جس کی سحر بھی	
اس حال میں کہنا ہے نہ کہنے کے برابر	جب بات میں بعد از اثر آ جائے مگر بھی	
ہے اس میں کسی دیکھنے والے کی خطا کیا	لگ جاتی ہے بندے کو خود اپنی ہی نظر بھی	
چھن پائے نہ مٹی مری، چھن پائے تو شاید	مل جائے کسی چھاننے والے کو گہر بھی	محمد ارشاد
چلیں ہم صبح، جانے کب سفر میں شام ہو جائے	نہ ہو ایسا کہ رستے میں ٹریفک جام ہو جائے	آصف ثاقب
دیکھ تو اے دلِ تیرہ، تیرے گھر کون آیا	اشک بن کر میری آنکھوں میں اتر کون آیا	خالد احمد
باہر باہر جو بھی کچھ ہے سب ہے وہ بہروپ	اندر سے تو ویرانہ ہیں ہم اور تم اور وہ	امجد اسلام امجد
کرنی ہے اس سے ایک ملاقات آخری	جو رہ گئی ہے بات بتانی ہے اور بس	جلیل عالی
فقیرِ بے نوا کی اک ادا سے	الٹتے تخت دیکھے ہیں دعا سے	حسن عسکری کاظمی
آیا ہے وہی پہلے پت جھڑ کی نگاہوں میں	جس پیڑ نے رکھی تھی ہر شاخ ہری اپنی	نسیم سحر
خاک زادوں میں جو آ بیٹھے ہو خلعت پہنے	کسی دربار کے ٹھکرائے ہوئے لگتے ہو	خاور اعجاز
جو ترکِ الفت کے بعد بھی ہم ملے تو منظر عجیب ہوگا	نہ ان کے لب پہ جواب ہوگا نہ میرے دل میں سوال ہوگا	رشید آفریں
ڈر رہا ہوں آنے والے موسموں سے	میں نے دیواروں پہ لکھے کو پڑھا ہے	ممتاز اطہر
میری بچیو تمہیں اپنے اپنے گھروں میں رہنا نصیب ہو	مری بچیو وہاں کوئی کچھ بھی کہے زباں نہیں کھولنا	محمد انیس انصاری
اگرچہ ایک ہی کمرہ ہے میرے حصے میں	مجھے ملی ہے مگر سارے گھر کی بے چینی	ناصر علی سید
تم ہو ازل کی صبح تو میں ہوں ابد کی شام	میرے تمہارے بیچ قیامت کا فرق ہے	مسعود صدیقی رضی
اسی لیے کوئی کشتی بنانے والا ہے	اسے خبر ہے کہ طوفان آنے والا ہے	گلزار بخاری
عمر بھر اونچی اڑانوں میں رہے	خاک سے رشتہ مگر ٹوٹا نہیں	یعقوب پرواز
جس روز ہم ادھر سے اُدھر ہو گئے کہیں	ڈھونڈے گی پھر ہمیں یہی دنیا ادھر اُدھر	حسن عباس رضا
گرچہ ہوتی ہیں بجلیاں موجود	پھر بھی رہتے ہیں آشیاں موجود	منظور ثاقب
پھول، دھنک، مہتاب ملیں تو	اس کا پیکر بن جاتا ہے	احمد جلیل
دنیا کو بدلنا بڑا مشکل ہے لہذا	رہتے ہیں فرشتے بھی یہاں ذات بدل کر	راحت سرحدی
بہت پیچھے کہیں اب رہ گئے ہیں	وہی خرگوش کی رفتار والے	ممتاز راشد لاہوری
گم گشتہ محبت کو صدا کیوں نہیں دیتے	اک تاج محل پھر سے بنا کیوں نہیں دیتے	حسنین بخاری
کچھ ایسا زور تھا خود آگہی کے پانی میں	میں خود سے دور نکلتا گیا روانی میں	جمشید چشتی
ایک چھوٹے سے گاؤں میں گذری	زندگی ماں کے پاؤں میں گذری	ہارون الرشید
دیکھتے یوں ہیں شیخ رندوں کو	جیسے تکفیر کرنے والے ہیں	حسنین سحر
خوب سے خوب تر کی خواہش میں	ہم میسر سے ہاتھ دھو بیٹھے	ارشد شاہین
بہت گھنا ہے یہ عرفانِ ذات کا جنگل	جلاؤ مشعل مسافر بہت اندھیرا ہے	علی ارمان
میں ڈٹ گیا تو خوف کا بادل بھی چھٹ گیا	پھر آس پاس دب کے کہیں ڈر نہ تھا کوئی	شفیق احمد خان
ہر ایک باب میں اک درد فاش کرتا تھا	میں رو پڑی تھی اسے داستاں سناتے ہوئے	شبہ طراز
جدا تو ہونا ہے لڑنے کی کیا ضرورت ہے	تکلفات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے	طالب انصاری
وہ جو سود و زیاں سے بالا ہے	اس پہ آتا نہیں زوال اے دل	افشاں سجاد

جب شام ڈھلے اس کو کیا پیار سے رخصت	آنکھیں بھی ہوئیں نم تو پریشاں ہوا دل بھی	شوکت محمود شوکت
تماشا دیکھنے کو آئے ہیں ہم تو دکانوں کا	ہمیں بازار سے کوئی خریداری نہیں کرنی	ریاض ندیم نیازی
گھر کے اندر اس قدر سائے کہیں سے آ گئے	بولتا میں ہوں صدا دیتا ہے کوئی اور بھی	محمد نوید مرزا
دل کے ورق ورق پہ رقم ہے اسی کا نام	موجود ہے بیاض کا بانی بیاض میں	امتیاز الحق امتیاز
اب اُن سے مہر و مروّت کی بات کیسے ہو	لئے جو ہاتھ میں تیر و کمان بیٹھے ہیں	افروز رضوی
ویسے ہی وہ خاطر میں مجھے لاتا نہیں ہے	اوپر سے بھی اس کو سکھانے میں لگے ہیں	ذکی طارق
ویسے تو ہر کسی کو ٹھکانہ عزیز ہے	ہم کو تمہارے شہر میں آنا عزیز ہے	آصف شفیع
خود کو فوزی چھپائے پھرتی ہوں	میری شہرت ہے اس کی رسوائی	فوزیہ تبسم
کوئی مے خوار گذرا ہے یہاں سے	تبھی تو راستہ بہکا ہوا ہے	افتخار شاہد
ہم فقیروں کو پتہ ایسا کوئی مشکل نہیں	ایک ہی کٹیا بنی ہے قصرِ سلطانی کے ساتھ	محمد سلیم ساگر
جہاں ہم تھے وہاں سے لامکاں نزدیک پڑتا تھا	ہم اپنی بے گھری کی آخری منزل میں رہتے تھے	شاہد ماکلی
کوئی تو رنج تھا دل میں کہیں چھپایا ہوا	ذرا سی بات بھی ماچس کی ایک تیلی ہوئی	رخشندہ نوید
ایک میں ہوں کہ میرے ہاتھ ہیں خالی اب تک	ایک تو ہے کہ ترے ہاتھ سمندر آئے	اشرف کمال
عشق سے مشورہ کرنا پڑے گا دوستو	امتحانِ عشق ہے اور اپنی تیاری نہیں	انصر حسن
زندگی سے فرار ممکن ہے	ہجر کی راہ سے فرار نہیں	عمران اعوان
اور کیا رہ گیا خوش رہنے کو باقی اصغر	میں فقط شعر کی مستی لئے خوش رہتا ہوں	اصغر علی بلوچ
بد نصیبی ہے اگر بھوک گلے پڑ جائے	گھر کا سامان بھی بازار میں آ جاتا ہے	تصدق شعار
ہم کو سوات وادی کا جس نے پتہ دیا	اس مہ جبیں کو ڈھونڈنے کالام تک گئے	توقیر قریشی
کیا قیامت کا زمانہ آنے والا ہے یہاں	گلیاں سونی سونی ہیں بازار ہیں سہمے ہوئے	علی حسین عابدی
اس کی آنکھوں میں تھی اک الگ روشنی	چاند تارہ کوئی یوں چمکتا نہیں	بشیر احمد حبیب
سارے سخن شناس نہیں ہیں جو آئے ہیں	بعد از مشاعرہ بھی کوئی بند و بست ہے	فخر عباس
رضا ہیں اور کئی منزلیں نگاہوں میں	نظر کا ساتھ مگر بال و پر نہیں دیتے	رضا اللہ حیدر
دیکھے گا کون کون ستارے کی آنکھ میں	منظر بدل رہا ہے نظارے کی آنکھ میں	ساگر حضور پوری
وہ کھینچتا ہی نہیں ہاتھ نعمتوں سے کبھی	شبانہ روز ہی اس کی عطا کا موسم ہے	آفتاب خان
یہ کشمکش در و دیوار کی بتاتی ہے	مکیں کے جتنے بھی دکھ تھے وہ اب مکاں کے ہیں	واصف سجاد
روزِ اول سے یہی کرتا رہا ہے آدمی	سوچتا کم اور زیادہ بولتا ہے آدمی	نیاز احمد چوہدری
اس طرح مل رہے ہیں گھر والے	جیسے میں اپنے گھر نہیں آیا	اکرم جاذب
شب بھر کسی خیال میں الجھا رہا ہوں میں	وقتِ سحر اٹھا ہوں تو ٹوٹا ہوا ہے جسم	ظہور چوہان
مجھے جس سے کوئی طلب نہ تھی وہی میرے ساتھ کھڑا رہا	میں پڑا تھا جس کے لئے یہاں وہی مہرباں نہ ہوا کوئی دن	سید فرخ رضا ترمذی
کھول کر خود نہ پڑھ سکا ان کو	بانٹتا ہی رہا سپارے میں	سید ضیا حسین
ہمارا بچپن کا یار تھا جو وہ چاہتا ہے	ہم اس کو بولیں جناب عالی، جناب عالی	صغیر احمد صغیر
پھر کسی دور کی مسافت میں	لمحہ لمحہ بکھر رہے ہو تم	طلعت شبیر
دستِ آذر کی مہارت کا اثر ہوتا ہے	ورنہ کہسار سے شہکار نہیں بن سکتے	ارشد محمود ارشد
شہر سانپوں کا اس لئے ہے عطا	والیِ شہر خود سپیرا ہے	عطا العزیز
وہ قربتوں کو بھی دوری کا رنگ دیتا ہے	کھلے کھلے مری بانہیں اکڑنے لگتی ہیں	خالد احمد
ترا خیال ہمیں چھو کے جب گزرتا ہے	وجود کو بڑی مشکل سے ہم سہارتے ہیں	ثمینہ سعید
عشق اور وحشت میں فرق ہے فقط اتنا	وحشتوں کے تیروں کا عشق ہی نشانہ ہے	رخسانہ سحر
ایک بھی خواب نہیں زندہ میری آنکھوں میں	آپ کی آنکھوں میں تدفین ہوئی سب کی ہوئی	اسد اعوان

مجھے تو جھوٹ بھی سچ عنبرین لگتا تھا	کچھ اس طرح وہ ستاتا تھا راستی مجھ کو	عنبرین خان
ہاتھ کو میرے جھٹک کے چل دیا سایہ میرا	میں ابھی یہ پوچھنے والا ہی تھا ناراض ہے؟	ارسلان ساحل
جب وہ آتا ہے سرِ شام ، لبِ بام کبھی	آسماں ہم ترا مہتاب نہیں دیکھتے ہیں	فرہاد ترابی
ہو ہی نہیں رہا تھا ترے زہر کا اثر	آخر ہماری موت ہوئی زندگی کے ساتھ	رضی رضوی
یہاں تو لوگ بدلتے ہیں صورتیں ایسی	چلیں گے ساتھ مگر ہم سفر نہیں ہوتے	آفتاب محمود شمس
فکر کے زہراب میں رس گھولتے تاثیر کا	درد کب محتاج ہوتا ہے کسی تشہیر کا	خالد احمد
بکھرا رہا ہوں کب سے بکھر ہی نہیں رہا	اک شخص میرے دل سے اتر ہی نہیں رہا	کاشف واصفی
میں ہار ماننے والوں کو بھول جاتا ہوں	یہ دل کی جیت ہے جس کا خمار باقی ہے	امجد بابر
یہ رسمِ تازہ گلاب پاشی بھی چیر دیتی ہے گل کا سینہ	کہ پھول کی شہ رگ دریدہ ہے بے رخی کی تمازتوں سے	عاطف جاوید عاطف
مل جائے ترا جسم جو مسکن کو تو کیا بات	ورنہ یہ میرے جسم کو زندان تو ہے نا	عزم الحسنین عزمی
تم کہ جس پہ غرور کرتے تھے	وہ جوانی کہاں گئی ہے میاں	علی آرش
وہ شعر فہم ، زمانہ شناس لڑکی ہے	غزل کہے گی تو لہجہ جدید کر دے گی	دانش عزیز
یقیناً آپ تو ایسے نہیں تھے	مروت اٹھ گئی شاید جہاں سے	سرفراز عارض
ہم نے اشکوں سے دوستی کر لی	اب سمندر سے ڈر نہیں لگتا	عاصم اعجاز
ہم تلاشِ وفا میں نکلے تھے	پھر نہ پاؤں رکاب سے نکلے	شہزاد احمد شاذ
تری زندگانی کا مقصد یہی ہے	محبت محبت محبت کیے جا	طاہر حسیب طاہر
لوگ سڑکوں پہ نکل آئیں گے	یہ سرِ شام قیامت نہ کرو	عقیل شافی
تو پھر گیتوں کے فوّارے پھوٹتے ہیں میرے لہجے سے	پرندہ آ کے میرے سامنے جب گنگناتا ہے	شہاب اللہ شہاب
خدائے میرا عطا ہو مجھے کوئی مصرع	میں شاعری کو حوالہ بنانے والا ہوں	محمد علی ایاز
پتا پتی بکھر نہ جائے کہیں	پھنس گیا ہے گلاب کانٹوں میں	کومل گل
دوسری بار تردد نہیں کرنا پڑتا	پہلی دستک پہ ہی ترسے ہوئے در بولتے ہیں	اسد رضا سحر
حقیقت کا اس سے تعلق نہیں ہے	جو تصویر سب کو دکھائی گئی ہے	راجہ عبدالقیوم
میں محبت کا ہوں اک گیت ، یہ سن لو جاناں	تم مجھے چاہتی ہو دل سے تو گا سکتی ہو	وسیم ہیران
چپ جو بیٹھے ہیں تیری محفل میں	جانے کیسے دکھوں کے مارے ہیں	میثم محسن
دل سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا	اس نے کیا خوب دل سنبھالا ہے	مظفر نقوی
ساتھ میرے اداسی رہے رات دن	میری محسن ہے یہ میری بجلی ہے یہ	کشور رباب
جو میرا دشمنِ جانی مجھے جینے نہیں دیتا	وہ میرے اپنے گھر کی چار دیواری سے نکلے گا	زرین علی رضوی
آخری نقش بھی ہونے کا مٹا دیتے ہیں	میری تصویر وہ پلکوں سے گرا دیتے ہیں	
اپنے دل میں کہیں نفرت کو جگہ دیتے ہوئے	جانے کیوں لوگ محبت کو بھلا دیتے ہیں	
باتوں باتوں میں تری یاد دلانے والے	کتنے سوئے ہوئے خوابوں کو جگا دیتے ہیں	
رنج کی اوس میں بھیگے ہوئے معصوم حروف	میرے ہر شعر کو شہکار بنا دیتے ہیں	
کم سے کم شور مچاتے ہوئے طائرِ نعمان	گھر میں تنہائی کا احساس مٹا دیتے ہیں	نعمان منظور
بیتے دنوں کی دھوپ سمٹنے کی دیر تھی	سایوں نے لے لیا مجھے اپنے حصار میں	
ٹوٹا پڑا تھا نیند کا دھاگا مری طرح	سو میں نے اس میں خواب کے موتی پرو دیے	سعید شارق
شاخ در شاخ یہ کیا ڈھونڈ رہے ہو خالد	ایک وہ تھا تو یہ سارا چمن آراستہ تھا	خالد علیم
آپ کی اطاعت ، خدا کی اطاعت	کہ تعریف جن کی خدا کر رہا ہے	اویس جمیل

احترامات فراواں کے ساتھ اجازت۔ فقط والسلام مع الاکرام۔

محمد انیس انصاری

معظمی عمران منظور، نعمان منظور، اعجاز رضوی صاحبان

مدیر و معاون مدیر ماہنامہ بیاض، لاہور

السلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ!

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

دو تین ماہ کے وقفے کے بعد طبیعت بحال ہوئی تو 'بیاض' سے بار دگر معانقہ ہوا۔ اس عرصہ میں دوری کی کلفت کا احساس غالب رہا۔

الحمد للہ اب تو ''آملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک'' اس دوران بہت سے احباب نے فون پر اور بالمشافہ دعاؤں میں یاد رکھا۔ ادارہ 'بیاض' کی جانب سے جناب اعجاز رضوی نے فون پر مزاج پرسی کی اور دعائیں نذر کیں۔ ان کا بے حد شکریہ۔

یہ دیکھ کر کہ 'بیاض' کے تازہ شمارے میں حصہ شعر و سخن وافر ہے بہت جی خوش ہوا۔ تاہم قلم قبیلہ سے محترمہ بشریٰ رحمٰن کے چلے جانے سے دکھ ہوا۔ مگر کیا کیا جائے کہ کچھ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ مشیت اور موت کا ہاتھ کوئی نہیں روک سکتا۔ محترمہ بشریٰ رحمٰن نے اردو ادب میں گراں قدر خدمات انجام دیں ہیں۔ وہ ایک معتبر ناول نگار، افسانہ نگار، کالم نگار اور سفر نامہ نگار ہونے کے ساتھ مخصوص لب و لہجہ کی شاعرہ بھی تھیں۔ چمن زار ادب ان کی سانسوں کی مہکار سے تادیر مہکتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت کی پناہوں میں رکھے (آمین)

ڈاکٹر اجمل نیازی نے ایک عرصہ تک ادبی منظر نامے میں رنگ بھرے ہیں۔ وہ خالد احمد کے دوستوں میں تھے۔ کالم نگاری نے ان سے شاعری کا وقت چھین لیا تھا۔ مگر وہ زندہ دل آدمی تھے۔ دوستوں اور چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ رہنے والے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

روحی کنجاہی بھی عصری ادب کا معتبر حوالے تھے اور رہیں گے۔ ادبی حلقوں میں انھیں جو مقام حاصل رہا۔ کم کم کو نصیب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے ان کی بخشش کی دعا کرتا ہوں۔

جی چاہتا تھا کہ زیرِ نظر شمارے سے منتخب اشعار کوٹ کر کے شعرائے کرام کو حروفِ تحسین پیش کروں۔ اس مقصد کے لیے اشعار نشان زدہ بھی کیے، لیکن وہ اتنی تعداد میں ہیں کہ طبیعت ساتھ نہیں دے رہی۔ شاعروں کی فہرست میں چند ماہ سے اپنے دوست اور جھنگ کے معروف شاعر عاصم اعجاز کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ وہ ایک خوش کلام اور خوش گلو شاعر ہیں۔ محفلوں کی جان ہیں۔

جناب شاہد ماکلی ''شاعرِ امروز'' کے صفحات میں کمال کے شاعروں کو متعارف کروا رہے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ فیصل عجمی کے ''آثار'' سے بحیثیت مدیر وابستہ ہیں۔ ''آثار'' سے ثمینہ راجہ کے دور میں تعلق خاطر پیدا ہوا تھا اور چھپنے کا موقع بھی ملا تھا۔ کافی مدت کے بعد 'الحمرا'' سے اس پرچے کی خیر خبر ملی تو بہت خوشی ہوئی۔ ''آثار'' عہدِ نو کا نمائندہ رسالہ ہے۔ جو اپنے آہنگ اور معیار کے اعتبار سے مختلف اور منفرد ہے۔ شاہد ماکلی ہر شاعر کے تعارف میں جو فریم سپردِ قلم کرتے ہیں وہ ان کی ارفع نظری، فکری پختگی اور اظہار و ابلاغ کی ساحرانہ صلاحیتوں کی غمازی کرتے ہیں۔

نثر کے باب میں جناب شوکت علی شاہ کی ''آپ بیتی'' میری پہلی چوائس ہے۔ میں ان کا دیرینہ پرستار ہوں۔ مصطفےٰ زیدی کے ایک شعر کے حوالے سے (جو ان کے ابتدائیہ کا جزو ہے، فون پر ان سے بات بھی ہوتی رہی ہے۔ مجھے شوکت علی شاہ کے حافظے، ڈکشن اور واقعہ نگاری کی دلکشی ہمیشہ سے ہانٹ کرتی آئی ہے۔ اس ماہ انھوں نے جب خاتون رکن اسمبلی کے نام کا (بوجوہ ذکر کیے بغیر) ان کے علاقے کے پستہ قامت عوامی نمائندوں کو ایکسپوز کیا ہے، وہ پیراگراف صاف پتہ دے رہا ہے کہ وہ شخصیت محترمہ بشریٰ رحمٰن کی ہے۔ انھوں نے اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں محترمہ بشریٰ رحمٰن کی جس تقریب کا کیا ہے یہ واقعہ بھی میرے زمانہ طالب علمی (73-1971) کا ہے، جب میں اس کالج میں بی ایس سی کا طالب علم تھا۔ اس زمانے میں غلام حسین ساجد اور ڈاکٹر علی ظہیر منہاس بھی ہمارے ہم مکتب تھے۔ پچاس برس گزرنے کے باوجود وہ سنہری یادیں آج بھی تازہ ہیں۔

اختتام کی طرف بڑھتے ہوئے نیک تمنائیں اور دعائیں آپ کی نذر کرتا ہوں۔

طالب انصاری

مکرمی جناب عمران منظور صاحب

مسنون سلام اور بہت احترام

سرورق پر اردو ادب سے وابستہ چار عظیم شخصیات کی تصاویر کے ساتھ ''بیاض'' کا شمارہ بابت مارچ 2022 واقفِ نظر ہوا۔ امتنان گزار ہوں۔

پرچہ ہمیشہ کی طرح وقیع مندرجات سے بھرپور ہے۔ ''بیاض' ملتے ہی مطالعہ شروع کر دیتا ہوں۔ میرے ہاں واہ اور ٹیکسلا کے جو ادبی دوست آتے رہتے ہیں، وہ بھی اس موقر ادبی جریدہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ دو روز پہلے ٹیکسلا کی شاعرہ محترمہ شفقت حیات شفق صاحبہ آئیں۔ ابھی میں نے پرچہ کا کلی مطالعہ نہیں کیا تھا کہ پڑھنے کے لیے مانگ کر لے گئیں۔ شاید وہ بھی اپنی

تخلیقات آپ کو بھیجیں۔ دیکھ لیجیے گا۔

مضامین حسب سابق بہت عمدہ تھے۔ ہارون الرشید صاحب نے ڈاکٹر اجمل نیازی کو اپنی یادوں میں شریک کیا۔ اجمل نیازی صاحب مسلم الثبوت نثر نگار تھے۔ بہت عرصہ تک بے نیازیاں کے عنوان سے کالم لکھتے رہے ایک بات جو ہارون الرشید صاحب کے مضمون کے آخر میں اجمل نیازی صاحب کی تحسین کرتے ہوئے لکھی کہ وہ "ہمیشہ قومی لباس پہنتے تھے اور سر پر مخصوص دھاری دار پگڑی باندھتے تھے۔" کے ضمن میں عرض گزار ہوں کہ پگڑی تو قومی لباس میں شامل نہیں ہے۔ اجمل نیازی صاحب اسے علاقائی یا قبائلی شناخت کے طور پر باندھا کرتے تھے کہ انھیں اپنی مخصوص شناخت سے پیار تھا۔ لیکن وہ انتظار حسین پر ہمیشہ نکتہ چیں رہا کرتے تھے کہ یہ لاہور میں رہتے ہوئے دلی والوں کا پہناوا کیوں پہنتے ہیں۔ اپنی شناخت سے پیار، دوسروں کی شناخت کا استرداد چہ معنی دارد؟

محمد ارشاد صاحب نے "چلتے چلتے" میں سلیمان عبداللہ ڈار صاحب کی خوب گوشمالی کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ہاں مروج تصوف انسان کو معطل اور عضو معطل بنا رہا ہے۔ زندگی کی سرگرمی کو جمودی افسردگی میں بدل رہا ہے۔ خانقاہی نظام نے اس نوع کے تصوف کو پروان چڑھانے میں خوب کردار ادا کیا ہے۔ اور خانقاہی نظام کے پروردہ لوگوں نے اسلام کے حرکی اور لاطبقاتی نظام کو کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بلکہ جاگیرداروں اور استحصالی گروہوں کی ہمیشہ پشت پناہی کی۔ برٹرینڈ رسل کے حوالے سے بھی محمد ارشاد صاحب نے اچھی توضیحات پیش کیں۔ رسل خدا کے وجود کے بارے میں تذبذب کا شکار تھا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں کچھ سائنسی انکشافات اور نئے نئے نظریات کی بھرمار سے خدا سے انکار کی ایک لہر چل پڑی تھی کہ فلسفہ کے مبتدی بھی جھٹ سے خدا کے وجود سے انکاری ہو جاتے تھے۔ فی زمانہ کائنات میں پھیلی وسعتوں اور مزید حیرت انگیز انکشافات نے بڑے سے بڑے سائنس دانوں اور فلسفیوں کو خدا کے حوالے سے یہ کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہم نہیں جانتے خدا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ یہی نکتہ نظر برٹرینڈ رسل کا تو کہ "میں یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ خدا ہے اور یہ بھی ثابت نہیں کر سکتا کہ وہ نہیں ہے۔"

رانا سعید دوشی کا تجسم ریحان کی افسانہ نگاری پر تحسینی مضمون بھی خوب تھا۔ تجسم صاحب میرے دوستوں میں سے ہیں اور میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں سے واقف بھی ہوں۔ اس بنا پر مضمون میں رانا دوشی کی کہی گئی باتوں کی سچائی کا معترف ہوں۔ پرچہ میں شامل رانا سعید دوشی کی نظم بھی تخلیقی وفور سے بھرپور تھی۔ یوں تو رانا صاحب غزل کے شاعر ہیں۔ تاہم کبھی کبھی نظم بھی کہتے ہیں اور جب نظم کہتے ہیں تو دل کو سرور کا نذرانہ دیتے ہیں۔ عامر رضوی صاحب کا کرشن چندر کے فن افسانہ نگاری کا نفسیاتی تجزیہ ایک معلوماتی مضمون تھا۔ شعری حصہ میں یوں تو سب تخلیقات آپ کے حسنِ ادارت کی دلیل ہیں۔ تاہم چند پسندیدہ اشعار درج کر رہا ہوں قندِ مکرر کے طور پر:

چلیں ہم صبح، جانے کب سفر میں شام ہو جائے	نہ ہوا ایسا کہ رستے میں ٹریفک جام ہو جائے	آصف ثاقب
مدت سے اک جگہ پر ہے قصہ رکا ہوا	اک بے جواز طویل بیانی ہے اور بس	جلیل عالی
دنیا کو بدلنا بڑا مشکل ہے لہٰذا	رہتے ہیں فرشتے بھی یہاں ذات بدل کر	راحت سرحدی
کچھ ایسا زور تھا خود آگہی کے پانی میں	میں خود سے دور گیا روانی میں	جمشید چشتی
یہ راکھ میرے قتل شدہ جذبوں کی راکھ ہے	رکھی ہے جو بطور نشانی بیاض میں	امتیاز الحق امتیاز
میری طرح تجھے بھی کرنا عشق ہے مگر	دونوں کے درمیان عبادت کا فرق ہے	صفدر صدیق رضی

اشرف کمال

محترم عمران منظور، نعمان منظور صاحب السلام علیکم!

ماہنامہ "بیاض" کا مارچ کا شمارہ موصول ہوا۔ چار اہم شخصیات کی یادگار تصاویر کے ساتھ حسین سرورق۔ حسب روایت حمد، نعت، بھرپور غزلوں اور نظم ونثر لیے ہوئے ایک ادبی شمارہ۔ شاعری کے علاوہ افسانوں اور مضامین کا خوبصورت انتخاب کیا گیا ہے۔

رسالہ کھولتے ہی دوسرے صفحے پر موجود خالد احمد کی نظم "آزاد" میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ دنیا کسی کے دکھ کو نہیں جانتی نہیں مانتی۔ اپنا دکھ خود ہی سہنا پڑتا ہے۔ اس نظم کا اختتام المیاتی انجام سے دوچار نظر آتا ہے:

سر بکھرے، نے ٹوٹی

دل کیا؟ ہر شے بکھری

لفظ ہوا میں کھو جاتے ہیں

چہرے بچے ہو جاتے ہیں

مرزا آصف رسول نے ''صل علیٰ محمد'' کی ردیف میں نعت لکھی ہے۔

آئنۂ ازل ہیں وہ، آئنۂ ابد ہیں وہ	ان پہ نگاہِ کبریا، صل علیٰ محمد

اعجاز رضوی کی نظم 23 مارچ کے حوالے سے وطن کے تناظر میں اہمیت کی حامل ہے۔
محمد افتخار شفیع کا مضمون جناب ''الف وسیم'' عقیدہ، راسخہ کی غزل ''اپنی نوعیت کا منفرد مضمون ہے۔ سید تحسین گیلانی کا مضمون جدیدیت، مابعد جدیدیت اور اردو افسانہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت مختصر ہے۔ تسنیم فردوس کا مرزا غالب کے حوالے سے مضمون بھی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں بات شاعری سے شروع ہو کے نثر تک پہنچی اور پھر شاعری پہ اختتام پذیر ہوئی۔
جناب اعجاز رضوی نے بسملین شاہجہانی کے فن شاعری پہ تبصرہ پیش کیا ہے۔
ناصر بشیر اور محمد شعیب مرزا نے اپنے اپنے انداز میں بشریٰ رحمن کے زندگی کے مختلف گوشوں پہ بات کی ہے۔
بڑی بھرپور غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ فوری طور پر درج ذیل شعر دل کو بھا گئے:

اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کر پائے	تم بھی مزدور ہو اور لائے ہوئے لگتے ہو	خاور اعجاز
ڈر رہا ہوں آنے والے موسموں سے	میں نے دیواروں پہ لکھے کو پڑھا ہے	ممتاز اطہر
مری کہانی میں اب کچھ نہیں بچا ناصر	اکھڑتی سانس ہے اور چارہ گر کی بے چینی	ناصر علی سید
ایک چھوٹے سے گاؤں میں گزری	زندگی ماں کے پاؤں میں گزری	ہارون الرشید
خوب سے خوب تر کی خواہش میں	ہم میسر سے ہاتھ دھو بیٹھے	ارشد شاہین
اپنی آنکھوں کو میں چھوڑ آیا ہوں چھت پہ ناصر	چاند کا کیا ہے؟ کسی وقت نکل سکتا ہے	ناصر بشیر
دیا جلاتے ہوئے راستہ دکھاتے ہوئے	میں چل رہی تھی کسی طور گنگناتے ہوئے	شہ طراز
نشان رکھتے ہوئے بے نشان بیٹھے ہیں	تمہاری بزم میں ہم بے زبان بیٹھے ہیں	افروز رضوی
چاندنی سو گئی ہے چپکے سے	رات لینے لگی ہے انگڑائی	فوزیہ تبسم
تمہاری دھڑکنوں کو کیا ہوا ہے	ہمارا تو یہ پہلا تجربہ ہے	افتخار شاہد
یوں بھی ہوتا ہے کہ میں روتے میں ہنس دیتا ہوں	اور اک صدمۂ اضافی لیے خوش رہتا ہوں	صفدر علی بلوچ
سنگ چنوا دیے جب اس نے جھروکے کی جگہ	اس کا چہرہ مری دیوار میں آ جاتا ہے	تصدق شعار
انھیں قبیلوں میں اپنا شمار ہے سید	کہ جو چراغ کی لو میں دھواں اتارتے ہیں	ثمینہ سید
اپنے دل میں کبھی نفرت کو جگہ دیتے ہوئے	جانے کیوں لوگ محبت کو بھلا دیتے ہیں	نعمان منظور

جلیل عالی، قسیم سحر، پروین گل، صدام ساگر، ساگر حضوری، آفتاب خان، واصف سجاد، ظہور چوہان، اکرم جاذب، طلعت شبیر، عنبرین خان، امجد بابر، علی آرش، سیّدہ محسن، اور دیگر شعرا کی شاعری بھی قابلِ ذکر ہیں۔ طوالت کے ڈر سے نمونہ کلام دینے سے گریز کیا ہے۔
بیاض اور اس کی انتظامیہ کو بلاشک و شبہ یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں ہر ماہ شاعری اور نثر کا ایک خوبصورت گلدستہ میسر آتا ہے۔

حکیم خان حکیم

برادرم عمران منظور، نعمان منظور اور اعجاز رضوی صاحبان
السلام علیکم!
''بیاض'' حسب روایت وقت پر 2 مارچ کو نظر نواز ہوا۔ ٹائٹل پر خالد احمد، روحی کنجاہی، ڈاکٹر اجمل نیازی اور بشریٰ رحمن کی تصاویر دیکھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ اللہ رب العزت ان سب کو جنت الفردوس میں آسودہ رکھے (آمین) ٹائٹل کے دوسری طرف دونوں اوراق پر کتابوں کے عکس بہت دل پذیر انداز میں جلوہ نما ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اب بھی کتابیں شائع ہوتی ہیں اور پڑھی جا رہی ہیں جو نیک شگون ہے۔ خالد احمد کی نظم ''آزاد'' کے کیا کہنے بہت پسند آئی دیکھیے:

دنیا والے کب جانیں گے	جان بھی لیں تو کب مانیں گے
کس دھن میں راتیں کاٹی ہیں	کیا کیا دیواریں چاٹی ہیں
کیسے کیسے دن دیکھے ہیں	قاتل کس کے بن دیکھے ہیں

بھاری بھاری زنجیروں میں
کس نے پکڑا؛ کس نے جکڑا
کومل کومل تصویروں میں
سکھ سپنے دکھ اپنے
پھول چنتے تھے
گیت بنتے تھے

حصہ حمد ونعت میں حسن عسکری کاظمی، آصف ثاقب، جلیل عالی اور اعجاز دانش خوبصورت انداز کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ خاور اعجاز، جعفر تخلیق کار ہیں۔ ہائیکو کا انداز جداگانہ اور مترنم ہے وطن کے لیے اعجاز رضوی کی نظم نے میرے جذبات کو بھڑکا دیا۔ کیا خوب مترنم اور معنی خیز ہے۔
حصہ غزلیات میں 99 ننانوے شعرائے کرام شامل اشاعت ہیں۔ ''بیاض'' کے شعرا کو ابھی ایک بار دیکھا اور پڑھا ہے۔ کلام تو سب کا ہی قابل ستائش ہے مگر جن کے اشعار دل پر نقش ہو کر رہ گئے وہ درج ذیل ہیں۔
خالد احمد، محمد ارشاد، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، خاور اعجاز، رشید آفریں، محمد انیس انصاری، یعقوب پرواز، منظور ثاقب، حسن عباس رضا، احمد جلیل، راحت سرحدی، جمشید چشتی، ہارون الرشید، طالب انصاری، شبہ طراز، شوکت محمود شوکت، ذکی طارق، افکار شفیع، فوزیہ تبسم، افتخار شاہد، شاہد ماکلی، رخشندہ نوید، اشرف کمال، رحمٰن فارس، بشیر احمد حبیب، فخر عباس، رضا اللہ حیدر، اکرم جاذب، ظہور چوہان، ثمینہ سید، رخسانہ سمن، علی آرش، دانش عزیز وغیرہ۔
شعبہ منظومات میں سبھی نظمیں پسند آئیں خطوط کے سلسلے میں اگر شبت تنقید کار بھی شامل کار ہوں تو نئے شعرا اور ادبا کے لیے ''بیاض'' ایک درس گاہ کی مکمل حیثیت حاصل کرے گا جزوی طور پر تو ''بیاض'' خالد احمد کے روپ میں نئے لکھنے کی اصلاح اب بھی کر رہا اور اسی وجہ سے اسے دیگر ادبی جرائد پر فوقیت حاصل ہے۔ اللہ رب العزت کارکنان بیاض کو سلامت رکھے۔ آمین

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور، اعجاز رضوی صاحب

السلام علیکم!
مارچ کا سرورق خالد احمد اور حال ہی میں دنیا چھوڑ جانے والی تین اہم ادبی شخصیات روحی کنجاہی، اجمل نیازی اور بشریٰ رحمٰن کی تصاویر پر مشتمل تھا۔ شمارے کے اندر ان شخصیات پر تحریریں بھی موجود تھیں۔ یوں ایک طرح سے ان کی ادبی خدمات کو سراہا گیا۔ حصہ مضامین میں محمد ارشاد اور محمد افکار شفیع نے دلچسپ تحریریں لکھیں۔ شاعر علی شاعر نے صائمہ اسحاق کی شاعری پر بھرپور تبصرہ لکھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر شاعر کا اپنا مطالعہ، اپنا اسلوب اور اپنا سفر ہوتا ہے۔ جس پر چل کر وہ آگے بڑھتا ہے۔ رانا سعید دوشی نے تبسم ریحان کے افسانوی مجموعے ''الجھے دھاگے'' پر خوبصورت تبصرہ کیا۔ تمام اہم افسانوں کا ذکر آ گیا۔ سید تحسین گیلانی نے افسانے کی جدیدیت پر تنقید و معلوماتی تحریر لکھی تحسین بھائی سے گزشتہ دنوں پوسٹ آفس میں ملاقات ہوئی۔ وہ بورے والا آئے ہوئے تھے۔ اسی دن ان کی سالگرہ بھی تھی۔ ڈاک خانے میں علی عمران حیدر بھائی نے ان کی سالگرہ کا اہتمام کیا۔ تحسین بھائی کی گفتگو اور زندہ دلی نے متاثر کیا۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ عموماً ادب سے وابستہ لوگ خاموش اور خشک مزاج ہوتے ہیں۔ تسنیم فردوس نے مرزا غالب کی برسی پر انھیں یاد کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو شاعری میں غالب کا نام ہی غالب رہے گا۔ ہارون الرشید نے ڈاکٹر اجمل نیازی کو خوب یاد کیا اور ان کی زندگی پر زبردست تحریر لکھی۔ حال ہی میں انتقال کر جانے والی پاکستانی کی معروف ادیبہ بشریٰ رحمٰن کی شخصیت پر ناصر بشیر اور محمد شعیب مرزا کی تحریریں بھی دلچسپ تھیں۔ تاہم یہ دونوں تحریریں اہم اخبارات (جنگ اور نوائے وقت) میں پہلے ہی پڑھ چکے ہیں۔ نسیم سحر کا ڈاکٹر فرحت عباس پر لکھا خاکہ ''سفیر نقد و نظر'' پڑھا اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ لوگ ذاتی نام و نمود اور شہرت کے سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور یہی کام یا اثر ان کا نام زندہ رکھتا ہے۔ علی رضا احمد کی تحریر ''جنگلوں کا سردار'' اور سیدہ آمنہ ریاض کے ''بخار کا بیان'' پڑھ کر جاسے محظوظ ہوئے۔ درج ذیل اشعار بھی پسند آئے:

خواب میں خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
میرے نکاد میں کوئی موسم کا پتا تو نہیں
اے مرے آج امرے کل کا پتا دے مجھ کو
کوئی کس طرح مرے قد سے گھٹا دے مجھ کو
خالد احمد

گھر جانے کی خواہش میں یہ خوف بھی لاحق ہے
آیا ہے وہی پہلے بہت جھڑ کی نگاہوں میں
لے جائے کہاں جانے پھر دربدری اپنی
جس پیڑ نے رکھی تھی ہر شاخ ہری اپنی
نسیم سحر

اپنے دل میں کہیں نفرت کو جگہ دیتے ہوئے
رنج کی اوس میں بھیگے ہوئے معصوم حروف
جانے کیوں لوگ محبت کو بھلا دیتے ہیں
میرے ہر شعر کو شہکار بنا دیتے ہیں
نعمان منظور

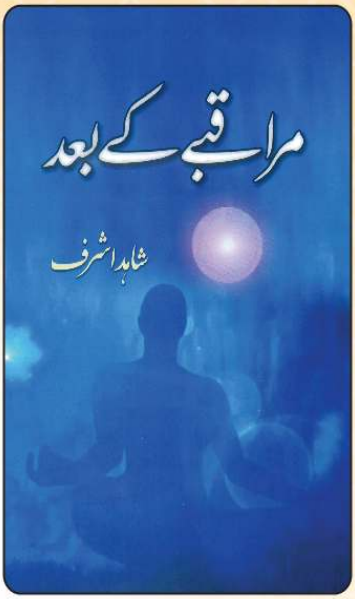
مراقبے کے بعد
شاہد اشرف

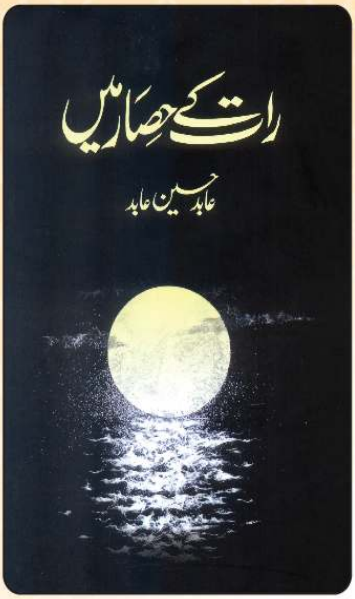
رات کے حصار میں
عابد حسین عابد

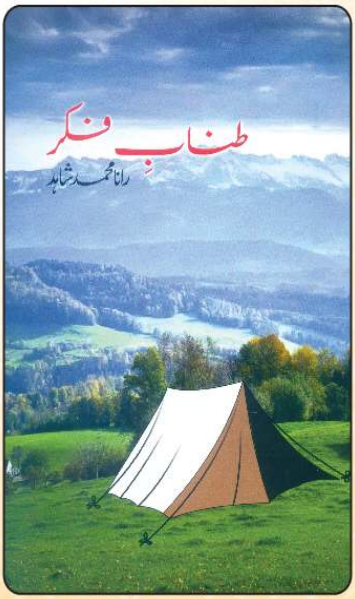
طنابِ فکر
رانا محمد شاہد

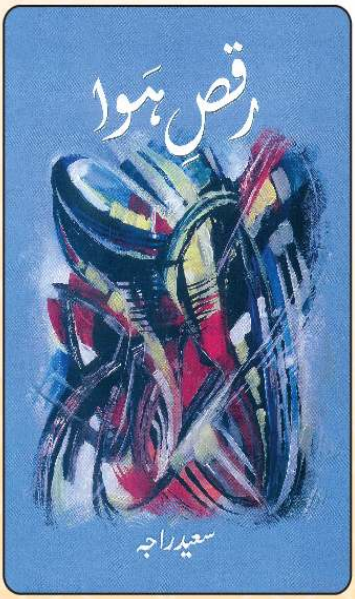
رقصِ ہوا
سعید راجہ